مجتبیٰ حسین نمبر
خیال
کراچی
کتابی سلسلہ سہ ماہی
ترتیب و تہذیب
Meer Zaheer Abass Rustmani

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

جدید رجحانات کا ادبی آئینہ

کتابی سلسلہ
سہ ماہی
خیال
کراچی

جلد ۷ شمارہ ۲۲ جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء

خط و کتابت/ترسیلِ زر کا پتا
C-03, Saima Towers,
Sector15A/5. Buffer Zone
North Karachi,Karachi 75850
Mob. 0331-4314437
PH:0092 21 6954440
PH: 0092 216631095

زرِ تعاون

موجودہ شمارہ: 100 روپے — سالانہ (بک پوسٹ) 400 روپے

سالانہ (رجسٹرڈ بک پوسٹ) 500 روپے — بیرون ملک: 30/امریکی ڈالر (یا اس کے مساوی)

فہرست

مجتبیٰ حسین۔ مشاہیر کی آراء

منظومات

مجتبیٰ حسین کے ادبی سیارے

افتخار عارف، طاہر نقوی، قیصر سلیم کراچی، نکہت بریلوی، عشرت رومانی، انوار احسن صدیقی

...... ☆ ......

اداریہ

جدید رجحانات کا ادبی آئینہ سہ ماہی ''خیال'' محترم حبیب احسن کی اعلیٰ ادارت میں اب جس منزل پر ہے یہاں تک پہنچنے کے لئے انہوں نے اور ان کے رفقاء نے یقیناً بڑی محنت کی ہے۔ اسی لئے خیال صورت اور معنوی دونوں صورتوں میں قارئین میں مقبول ہو رہا ہے اور اس میں ادب کی اہم شخصیات کے بارے میں شائع ہونے والے خصوصی شماروں اور گوشوں کو بھی بہت پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

قارئین کی اسی حوصلہ افزائی نے ہمیں اردو ادب کے ایک اور اہم قلم کار پروفیسر مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن کے بارے میں ''خیال'' کا خاص نمبر ترتیب دینے کا حوصلہ دیا۔ مجتبیٰ صاحب جو بنیادی طور پر افسانہ نگار اور شاعر تھے مگر تنقید جن کی پہچان بنی' وہ چونکہ 'پی آر' کے آدمی نہیں تھے اس لئے ان کے بارے میں اتنا کام نہیں ہوا جتنا ان کا حق بنتا تھا اور نہ ہی ادبی جرائد نے ان کے بارے میں خصوصی شمارے شائع کئے' اس لئے جب ''خیال'' کا مجتبیٰ حسین نمبر ترتیب دینے کا ارادہ کیا گیا تو ان کے احباب اور شاگردوں نے بہت حوصلہ دیا' مگر یہ حوصلہ زبانی کلام سے آگے نہ بڑھ سکا۔ متعدد بار گزارش کی گئی اور یاددہانی کے خطوط بھی لکھے گئے مگر خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ ہاں! چند لوگوں نے ضرور ہماری آواز پر لبیک کہا۔ ان کے ہم شکر گزار ہیں اس لئے مجبوراً شائع شدہ مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے انیس باقر نے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ عباس باقر نے محترمہ فوزیہ وحید کا ایم۔ اے کا مقالہ ''مجتبیٰ حسین بحیثیت خاکہ نگار اور نقاد'' عطا کیا' جو پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور میں ۱۹۸۸ء میں پروفیسر سجاد باقر رضوی استاد شعبۂ اردو کی زیرِ نگرانی تحریر کیا گیا اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اسے ہم یہاں شکریئے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ غالب باقر کا انٹرویو اور ان کے پاس موجود مجتبیٰ صاحب کے شعری خزانے سے چند غیر مطبوعہ چیزیں بھی بطورِ نمونہ پیش کی جا رہی ہیں۔ باقی چیزیں کتابی صورت میں وہ بعد میں شائع کریں گے۔ اس کے علاوہ مجتبیٰ صاحب کی نثری غیر مطبوعہ چیزیں کہیں بھی دستیاب نہ ہو سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ چیزیں لے گئے تھے۔

شاعر' ادیب' افسانہ نگار' نقاد' استاد' ہمدرد اور فرض شناس شوہر اور باپ مجتبیٰ حسین کی ہشت پہلو شخصیت کے بارے میں اُن کے دوستوں' شاگردوں اور بچوں کی تحریریں ان کی ہر دلعزیز شخصیت کی بڑائی' ان کے فن کی اہمیت اور ان کے گھر کی گواہی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی نثری اور شعری تحریریں' بقول خود مجتبیٰ صاحب' ان کے رنگین حافظے کی فسوں کاریاں ہیں:

پھر کام کر سکے نہ کہیں ذہنِ مضمحل
رنگین حافظے کی فسوں کاریاں ہیں یہ

''خیال'' نے اپنی دیرینہ روایات کے مطابق مجتبیٰ حسین نمبر کو بھی صُوری اور معنوی دونوں اعتبار سے خوبصورت بنانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ پھر بھی ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

ہم آئندہ بھی ادبی شخصیات کے نمبر اور گوشے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن قلم کاروں کی سردمہری سے خوفزدہ ہیں۔ خدا کرے ہمیں آپ سب کا تعاون حاصل رہے۔

جمال نقوی

مدیر

پروفیسر مجتبیٰ حسین کا سوانحی خاکہ

نام	:	سید مجتبیٰ حسین
ولدیت	:	سید باقر حسین (ڈپٹی کلکٹر)
ولادت	:	۱۹۲۱ء موضع سنجر پور، جونپور
تعلیم	:	ایم اے (اردو)، الٰہ آباد یونیورسٹی
برادران	:	سید مصطفیٰ حسین (انکم ٹیکس کمشنر، الٰہ آباد)
		سید ارتضیٰ حسین (سفیرِ پاکستان) معروضات
بہن	:	شمیم سید
بیگم	:	نرجس خاتون
بچے	:	انیس باقر، اقبال باقر، عباس باقر، غالب باقر

مصروفیات:

(پیشہ ورانہ):	سفارت خانہ چین، کراچی
	شعبہ اردو، نیشنل کالج کراچی
	بانی پرنسپل سراج الدولہ کالج، کراچی
	صدر شعبہ اردو، بلوچستان یونیورسٹی کراچی
(ادبی):	شریک مدیر، ماہنامہ 'شعور' کراچی
اعزاز:	UNO AWARD (بچوں کا ادب)
انتخاب:	منتخب ڈرامے (کمال احمد رضوی)
تخلیقات:	انتظارِ سحر (افسانوی مجموعہ)
(طبع شدہ)	انکار، اہرمن، بن بلایا مہمان...... (ڈرامے)
	تہذیب و تحریر، ادب و آگہی، نیم رُخ (تنقید)
	آغا شاعر قزلباش (تالیف)
(زیرِ طبع):	شعری مجموعہ، اردو مرثیہ عہد بہ عہد۔
پہلا شعر:	عرصے سے ان کے شعر و سخن کا اسیر ہوں
	میں بچپنے سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں
انتقال:	یکم اپریل ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر فردوس انور قاضی

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین کو پہلی بار میں نے 1975ء میں اس وقت دیکھا جب بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ایک استاد کی حیثیت سے قدم رکھا۔ وہ بلاشبہ ایسے استاد تھے جس کا ذکر بھی اب داستان کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی کسی دولت کے طالب کو خزانہ ملنے کے بعد ہو سکتی ہے۔ مجھ میں علم کی طلب تھی۔ انہیں طالبان علم کی جستجو۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

صرف میں ہی نہیں بہت سے جویائے علم و ادب ان سے فیض یاب ہوئے اور آج ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو ادب میں نمایاں نام اور نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ مجتبیٰ حسین کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ایک خاص مکتب فکر کے علمبردار ہونے کے باوجود ان میں نظریاتی حیثیت سے تشدد کا رویہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ ان کے پاس علم تھا' دلائل تھے اور باخبری بھی۔ یہی وجہ تھی کہ نظریاتی بحث و مباحثے کے وقت اپنی آواز میں سختی یا گھن گرج پیدا کر کے اپنی بات منوانے کی ضرورت انہیں کبھی پیش نہیں آئی اور نہ کبھی اچھی ادبی تحریروں کو محض نظریاتی اختلاف کی بناء پر رد کرنے یا ان پر الزام تراشی جیسی کج روی نے ان کی تحریروں میں راہ پائی۔

مجتبیٰ حسین علم و ادب کا ایک ایسا دبستان تھے جس میں پڑھنے والا کسی ایک مخصوص نظریئے کے تحت تعصب یا تنگ نظری کا شکار کبھی نہیں ہوا وہ ایک روشن خیال' وسیع النظر اور وسیع العلم ادیب تھے اور یہی تمام چیزیں ان کے شاگردوں کو ورثے میں ملیں۔

بعض نظریاتی اور افکار کی حد تک میرے اور مجتبیٰ حسین کے افکار میں بعد عظیم تھا۔ وہ سوشلسٹ تھے اور میں زندگی کو مذہبی اقدار کے آئینے میں دیکھنے کی عادی۔ ان کے خیالات میں پختگی' دلائل اور زندگی کا تجربہ تھا۔ ان کے جو بھی نظریات تھے انہوں نے ان خیالات کو فیشن کے طور پر نہیں اپنایا تھا اور نہ سیاست کی نیرنگی سے وقتی فیض اٹھانا ان کا مقصد تھا۔ لیکن اس کے باوجود میری بحث اور مباحثہ کا مقصد صرف یہ پوچھنا تھا کہ مزدوروں' کسانوں یا غریبوں سے ہمدردی اور معاشی مساوات کو ہم مارکس کے حوالے سے کیوں

سمجھتے ہیں؟ یہ احساس ہمارا اپنا احساس کیوں نہیں؟ یہاں اس تذکرے کا منشا بھی سوشلزم یا اخلاقیات کی بحث کرنا نہیں بلکہ اس آزادی کا احساس دلانا ہے جو مجتبیٰ حسین کے شاگردوں کو ان سے گفتگو کرتے وقت حاصل تھی۔ ان سے صرف سیکھنے کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس سے اختلاف کر کے بھی ان کی گفتگو سے نئی آگاہی نئی روشنی اور فکر کو نیا راستہ ملتا تھا۔

اپنی کلاس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد میں اور میرے دیگر ساتھی اساتذہ جو علم و ادب کے میدان میں زیادہ سے زیادہ آگاہی چاہتے تھے وہ گھنٹوں انہیں کے ساتھ بیٹھتے۔ ادب کا انحطاط' انسان کا زوال' انسان کی زندگی' اس کی زندگی' اس کی حقیقت' اس کے دکھ' اس کی خوشیاں' سیکڑوں سوالات ابھرتے ان کے پاس ہر سوال کا جواب تھا مجھے زندگی میں پہلی بار ایک اچھا استاد ملا تھا۔ سود و زیاں سے بلند' کتابوں میں گم' خیالات کے گھنے جنگل میں بھٹکتا ایک وجود۔ متجسس اور متوحش' بے خبری میں باخبری لئے' ہمہ وقت گفتگو کا جویا ان کی شخصیت' ان کی ذات' ان کی رفتار' ان کی گفتار' ان کا ہر رویہ ادب کی مجسم تصویروں سے تفسیر تھا۔ پھر بھی وہ اپنی تمام زندگی ادب کو سمجھنے میں مصروف رہے۔ ان کی گفتگو کے دوران سینکڑوں ادیب اور مفکروں سے شناسائی اور ان کے ادبی شاہکاروں سے آگاہی ملتی۔ مغربی افکار و نظریات کی روشنی میں فکر کو نئے نئے زاویئے میسر آتے اور ذہن میں روشنیاں سی پھیلتی چلی جاتیں ان کا حافظہ غیر مرئی قوت کا حامل تھا۔ وہ دنیا کی ہر زبان کے ادب اور ادیب سے آگاہ تھے ناول' تاریخ' عالمی سیاست' ذہنی اور فکری تحریکیں' فلسفہ ان تمام حوالوں سے اہم واقعات' اہم نام اور تاریخیں انہیں ازبر تھیں۔ ان کی گفتگو میں معنویت کے گنج ہائے گرانمایہ تھے۔ وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولے چلے جاتے۔ بعض علمی دقیق مسائل' فلسفیانہ فکر کی الجھی گتھیاں ان کی گفتگو کے ذریعے سلجھتی چلی جاتیں۔ لایعنیت اور معنویت کے تمام اسرار و رموز اپنی متضاد کیفیات کے ساتھ واضح ہوتے جاتے۔ گویا یہ علم کا ایسا فیض عام تھا جس سے ان کے ساتھ بیٹھنے والا ہر شخص فیض یاب ہو سکتا تھا۔

مجتبیٰ حسین کے ساتھ بیٹھ کر مجھے نہ صرف علمی پیاس بجھانے کا موقع ملا بلکہ ذہن میں بھٹکتے ہزاروں سوالات کو جیسے نکاس کا راستہ مل گیا تھا۔

اگر مجتبیٰ حسین کو کسی کے سوال میں معنویت کی روشنی نظر آتی تو ان کی آنکھوں میں جگنو سے جگمگانے لگتے۔ وہ بہت شوق سے ایسے سوالات کا جواب دیتے جن میں ذہانت شامل ہو۔ جیسے اندھیرے میں بھٹکتے

ہوئے آدمی کو کہیں سے روشنی کا سراغ مل جائے۔

انہوں نے میری ناچیز تحریر کی ہمیشہ تعریف کی ان کا خیال تھا کہ میری تحریریں Originality ہے۔ وہ ان لوگوں سے سخت نالاں تھے جنہوں نے گھسے پٹے جملوں پر مبنی اس فراڈ اندازِ تحریر کو اپنا رکھا تھا جسے ہر ادیب یا شاعر پر چسپاں کیا جا سکتا ہو۔ ایسی تحریر ان کے نزدیک اپنے آپ کو یا دوسروں کو دھوکا دینے کے مترادف اور ادب سے ناواقفیت کی دلیل تھی۔ وہ زبانی طور پر جھوٹ بولنے کو اتنا بڑا گناہ نہیں سمجھتے تھے جتنا بڑا گناہ ان کے نزدیک ادب کے حوالے سے جھوٹ بولنا تھا۔

کبھی کبھی وہ فرمائش کیا کرتے کہ میں ان پر کچھ لکھوں۔ نہیں معلوم وہ ایسا میری ہمت افزائی کے لئے کہتے یا سچ مچ میری تحریر کے آئینے میں خود کو دیکھنا چاہتے تھے لیکن میں نے جب کبھی ان پر لکھنے کی کوشش کی ایسا لگا جیسے زمین پر گرے ہوئے پارے کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہوں ان کی ہشت پہلو شخصیت کو احاطہ تحریر میں لانا آسان نہیں تھا اور میرا خیال تھا کہ میں یہ کام کبھی نہیں کر سکتی۔ اس بات کا یقین خود مجتبیٰ حسین کو بھی ہو گیا تھا لیکن ایک بار انہوں نے بھرپور یقین کے ساتھ کہا تھا کہ

''آپ مجھ پر لکھیں گی ضرور...... لیکن میرے بعد''

لیکن میں ان کے بعد بھی ان پر کچھ نہ لکھ سکی۔ ان کی ہر برسی پر میری خاموشی کو لوگوں نے حیرت سے دیکھا۔ لوگوں کے چہروں پر سجے سوالیہ نشان دیکھ کر بھی میں انجان بنی رہی۔ بارہ تیرہ برس مجتبیٰ حسین کی معاون استاد کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد میری خاموشی یقینی طور پر حیرت کا باعث تھی۔ اس پورے عرصے میں مجتبیٰ حسین کا یہ جملہ میرا تعاقب کرتا رہا کہ ''آپ مجھ پر لکھیں گی ضرور لیکن میرے بعد''

میں یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اپنی اس خواہش میں وہ روایتی انداز میں اپنی شخصیت یا تحریر کی تعریف یقیناً نہیں چاہتے تھے۔ ان کی تحریر اور شخصیت اس قسم کے تصدیق ناموں کی محتاج ہے بھی نہیں۔ غالباً وہ میری تحریر کے آئینے میں اس سچ کو دیکھنا چاہتے تھے جس کے بارے میں انہیں گمان تھا کہ وہاں تک میری رسائی ضرور ہوگی۔

لیکن اخلاقی اعتبار سے زوال پذیر اس معاشرے میں جہاں بدتہذیبی پر خوش اخلاقی کا خول چڑھا لینے کو شرافت، چند مفکروں اور فلسفیوں کے حوالے دے کر چرب زبانی کے فن کو علم و ادب کی معراج اور سوچ کی غلاظتوں پر تہذیب اور مذہب کے خوب صورت نقاب پہن لینے کو پارسائی تصور کیا جاتا ہو وہاں سچ بولنا

خود کو مصلوب ہونا ہر سچے ادیب کی قسمت ہے۔ تخلیق کا جبر اسے فرار کا موقع نہیں دیتا۔ کبھی نہ کبھی آخر کار اسے گرفتار کر لیتا ہے۔ سو آج میں قلم اٹھانے پر مجبور ہوں۔

یہ غالباً 75، 76ء تھا جب ہم اپنے طلبہ کے ساتھ اسٹیڈی ٹور پر جا رہے تھے۔ شعبہ اردو میں استاد کی حیثیت سے یہ میرا پہلا ٹور تھا۔ پتہ نہیں مجتبیٰ صاحب نے مجھ میں ایسی کون سی خصوصیت دیکھی کہ اپنا قلمی دیوان مجھے پڑھنے کے لئے دے دیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ اپنا کلام کسی کو سنانا بھی زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

میں اسے پڑھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد پڑھتے پڑھتے ٹرین کے ڈبے کا جائزہ لیا تو بعض طلبہ کیرم اور بعض خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میرے سامنے کی سیٹ پر مجتبیٰ حسین گہری نیند سو چکے تھے۔ اب میں نے دوبارہ مکمل یکسوئی کے ساتھ دیوان کا مطالعہ شروع کر دیا لیکن اس بار پینسل سے بعض اشعار پر کچھ تنقیدی اشارے لکھتی چلی گئی۔ بعض اشعار جو بہت اچھے تھے ان پر تعریفی نشان اور بعض جگہ کچھ کمزوریوں کی نشاندہی بھی کی۔ میری ایک بری عادت ہے کچھ بھی پڑھتے وقت اگر تعریفی یا تنقیدی پہلوؤں کی طرف نشاندہی نہ کروں تو مطالعہ ادھورا لگتا ہے۔ اسی بری عادت کے سبب مجتبیٰ حسین کے قلمی دیوان پر نشان لگانے سے خود کو نہیں روک سکی۔ نشان لگا دینے کے بعد مجھے بہت ڈر تھا اور نہیں جانتی تھی کہ اس گستاخی کا ان پر کیا ردِ عمل ہوگا۔ دیوان ختم کر چکنے کے بعد باہر دیکھا سورج مغرب کی سمت نیچے اتر آیا تھا۔ چند طلبہ چائے بنانے میں مصروف تھے۔ مجتبیٰ صاحب بھی اٹھ چکے تھے۔ ان کا قلمی دیوان میں نے نہایت خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اسے خاموشی سے رکھ لیا۔ نہ میں نے کچھ کہا نہ انہوں نے کچھ پوچھا۔ ٹور سے واپسی پر جب ان کی نظر میرے ریمارکس پر پڑی تو انہوں نے توقع کے خلاف حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ ان ریمارکس کی تعریف کی۔ انہوں نے میری تعریف اور تنقید دونوں کو کھلے دل سے تسلیم کیا تھا۔ ان کے اس طریقہ کار سے مجھے خوشی تو ہوئی لیکن اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ ادب سے دلچسپی رکھنے اور ان کے مطالعہ کے باوجود اس سے قبل کسی ادیب یا شاعر سے زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ شاید اس وقت میرا خیال یہ تھا کہ سب ادیب اور شاعر اتنے ہی کھلے ذہن کے مالک ہوتے ہوں گے لیکن بعد میں جب بعض ایسے پستہ قد ادیبوں اور شاعروں سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا جو پروپیگنڈے کی بیساکھیوں پر خود کو بڑا سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا تھے اور اپنی صاف گوئی کے تحت ان کی

تحریروں پر تنقیدی رائے دینے کی غلطی کر کے ہمیشہ کے لئے ان کی دشمنی سے واسطہ پڑا تب مجھے پہلی بار مجتبیٰ حسین کی بڑائی کا احساس ہوا تھا۔

مجتبیٰ حسین کے پاس جو کتابیں اور رسائل آیا کرتے تھے وہ اپنے مطلب کی چیزیں رکھ کر باقی سب مجھے دے دیا کرتے تھے۔ ایک دن ان کے پاس کہیں سے کوئی ڈائری آئی۔ وہ ڈائری بھی انہوں نے مجھے ہی دی لیکن میں نے وہ ڈائری انہیں لوٹاتے ہوئے یہ فرمائش کردی کہ اس میں وہ اپنا تمام کلام نقل کر کے پھر مجھے دیں۔ انہوں نے میری فرمائش کو خوشگوار حیرت سے سنا اور خاموشی سے وہ ڈائری رکھ لی۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد جب دوبارہ وہ ڈائری مجھے دی تو اس میں ان کی 28 جنوری 81ء تک کی نظمیں اور غزلیں موجود تھیں۔ اس ڈائری کا آغاز کچھ یوں ہے۔

ان اشعار کا کہنے والا جونپور (یوپی ہندوستان) کے ایک چھوٹے سے گاؤں سنجر پور میں پیدا ہوا سن پیدائش شاید 1922ء تھا۔

اس کا نام مجتبیٰ حسین تھا۔

اپنے اشعار کو سنانا بھی اسے کچھ زیادہ پسند نہ تھا۔ چہ جائیکہ پورے کا پورا کلام نقل کر دینا۔

گھڑی سامنے ہے ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ رات گرد آلود ہے۔

12 جون 1977ء۔ کوئٹہ یونیورسٹی کیمپس

آج اس وقت جب وہ ڈائری میرے سامنے کھلی ہوئی ہے تو میری آنکھوں کے سامنے بیتا ہوا ایک ایک منظر گزر رہا ہے اور وہ وقت یاد آ رہا ہے جب میں نے مجتبیٰ حسین سے بڑے ذوق وشوق سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ شعبہ میں میرا زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزرتا تا کہ ان کے علم سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہوسکوں۔ ان کے پاس اور بہت لوگ بھی جمع رہا کرتے۔ ادب' تاریخ' فلسفہ' معاشیات' سیاسیات' تہذیب وثقافت' حیات وممات غرض سینکڑوں موضوعات تھے جن پر گفتگو رہتی۔ زندگی کے نئے نئے زاویئے سامنے آتے۔ وہاں بیٹھ کر لوگوں سے مخاطب ہوئے بغیر مختلف شخصیتوں کا مطالعہ کرنے کا مجھے خوب خوب موقع ملتا۔ جو آہستہ آہستہ میرا مشغلہ بن گیا تھا۔ اس مطالعے کے دوران بھی مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے مختلف رخ سامنے آئے۔ منافق اور ذہنی اعتبار سے مفلس لوگوں سے انہیں شدید نفرت تھی لیکن اس کے اظہار کا طریقہ نرالا تھا۔ وہ ایسے لوگوں کا بہت پرتپاک انداز میں خیر مقدم کرتے اور جاتے

وقت گلے لگا کر رخصت کرتے۔ منافقوں کے ساتھ اس انداز میں منافقت کر کے اپنی دانست میں وہ انتقام لے لیا کرتے تھے لیکن ان کے چلے جانے کے بعد ان کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آتے اور بہت دیر تک بیزاری کے عالم میں خلاء میں نہ جانے کیا دیکھا کرتے۔

لیکن ان کا یہ انداز صرف منافقوں اور کھوکھلی شخصیتوں کے ساتھ ہی نہیں تھا بلکہ یہی انداز بعض ان لوگوں کے ساتھ بھی تھا جن سے انہیں وابستگی تھی۔ لہجے کا فرق، ان کی عقیدت مندی، اخلاق اور پرتپاک انداز کی معنویت تبدیل کر دیتا۔ لیکن اس فرق کو صرف وہی سمجھ سکتا تھا جس کی رسائی ان کے ذہن تک رہی ہو۔ ان کی عقیدتوں، محبتوں اور نفرتوں کی پراسرار تہیں ان کے لہجے میں رہا کرتیں۔ ان کے جذبے لفظوں کے محتاج نہیں تھے۔ ان کے لہجے کی معنویت کا صحیح اندازہ بعض اوقات اس وقت ہوتا جب وہ کسی ذہنی مفلس کی ادب شناسی اور ادب نوازی کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے۔ مجتبیٰ حسین کی تعریف اور موصوف کی احمقانہ خوشی دلچسپ اور حیرت انگیز صورت حال پیدا کر دیتی۔ میں نے نفرتوں میں محبت اور محبت میں نفرت کے جذبوں کو مجتبیٰ حسین کے رویوں میں دیکھا۔ لہجے لفظوں کی معنویت کو کیسے تبدیل کرتے ہیں اس حقیقت کا انکشاف ادب کو پڑھنے سے زیادہ مجتبیٰ حسین کی گفتگو سے ہوا۔ وہ بعض اوقات ان لوگوں سے بہت خوش اخلاق بن جاتے جو لوگ ان کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ نہایت تلخ لہجہ اختیار کر لیتے جو ان کے ذہن میں ذرا سی بھی جگہ پا سکتے تھے۔

جب کوئی ادب سمجھنے یا جاننے والا ان کے سامنے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتا تو ان کے لہجے میں ایک دم محبوبانہ بے اعتنائی پیدا ہو جاتی اور ایک شان بے نیازی سے وہ موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگتے یا خوش ہو جاتے۔ معلوم نہیں یہ ان کی فطرت کا شرمیلا پن تھا یا فطرت انسانی کی وہ کرشمہ سازی جو محبوب کو جفا سرشت بنا دیتی ہے لیکن یہ سب رویے عام لوگوں تک محدود تھے۔ جہاں تک علم و ادب کی بڑی شخصیتوں کی بات وہاں عجز و انکسار کے وہ انداز بھی دیکھے جن کا تصور بھی اس عہد میں محال ہے۔ جب ہم اپنے اسٹڈی ٹور پر تھے اس وقت مجتبیٰ حسین شعبے کے تمام طلبہ اور اساتذہ کو اپنے ساتھ لے کر جوش صاحب کے گھر گئے تھے۔ جوش صاحب کے سامنے مجتبیٰ حسین کی خندہ آوری، نفاست مزاج اور اس تہذیبی رویہ کو دیکھنے کا موقع ملا جو اس عہد میں تقریباً ناپید ہے۔ اس تہذیب میں عقیدت مندی، احترام اور محبت کا رنگ تھا۔ وہ ایک منکسر طالب علم کی طرح جوش صاحب کے سامنے دوزانو بیٹھے تھے۔ اس وقت

مجتبیٰ حسین اور جوش صاحب کی باتیں طلبہ کے لئے علم وادب' تہذیبی رویئے' شعراء اور ادباء سے آگاہی کا گویا عملی مظاہرہ تھا۔ اس ٹور میں ہم جوش صاحب کے علاوہ عزیز حامد مدنی' محب عارفی' احمد ندیم قاسمی' دیگر ادباء وشعراء اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے بھی ملے اور لاہور کی تمام اہم جگہوں کو اس کے تاریخی حوالوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ یہ شعبہ اردو کا پہلا (اور شاید آخری) ایک بامقصد اسٹڈی ٹور تھا۔ جو صرف مجتبیٰ حسین کے ساتھ ہی ممکن تھا۔

مجتبیٰ حسین نے جو عہد دیکھا تھا اس وقت ادب میں اقبال' پریم چند' ٹیگور' سیاست میں گاندھی جی' قائداعظم' جواہر لعل نہرو' ابوالکلام آزاد' مولانا حسرت موہانی جیسی عظیم ہستیاں زندہ تھیں۔ ان کے عہد طالب علمی میں جب وہ کالج میں پڑھ رہے تھے۔ مجاز' فیض' جذبی اور جاں نثار اختر جیسے شاعروں نے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ افسانہ نگاروں میں بھی کرشن چندر' بیدی' منٹو' عصمت چغتائی جیسی قد آور شخصیات موجود تھیں۔ تنقید نگاروں میں نیاز فتح پوری' مجنوں گورکھپوری' احتشام حسین' آل احمد سرور' فراق اور اعجاز حسین جیسے بڑے نام سامنے تھے۔ غرض جس عہد میں انہوں نے ہوش سنبھالا اور تہذیب' ادب اور سیاست کے اعتبار سے ایک زندہ اور شخصیت ساز عہد تھا۔ اپنے عہد کی تمام بڑی شخصیتوں کو انہوں نے دیکھا تھا اور بعض کو وہ بہت قریب سے جانتے تھے۔ مجتبیٰ حسین گفتگو کے فن میں ماہر تھے۔ اپنے عہد اور بڑی شخصیات کے بارے میں گفتگو کرتے وقت ان کے لہجے میں ہمیشہ ایک داستان گو کی رنگین بیانی اور دریا کی روانی آجاتی۔ ان کی باتوں میں مجسمہ سازی کا وہ کمال تھا جو اردو نثر میں محمد حسین آزاد کا وصف خاص ہے۔ مجتبیٰ حسین کی مجسمہ سازی میں سماجی وتاریخی شعور کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون اور عصر نو کی وضاحتیں بھی موجود تھیں۔ انہیں سنتے وقت ان کے تراشے ہوئے مجسمے زندہ حقیقت بن کر محسوس ہونے لگتے۔ یہ ان کی گفتگو کا کمال تھا کہ اس شخصیت ساز عہد اور عہد ساز شخصیتوں کو ہم نے کتابوں میں لکھی یا سنی باتوں کی طرح نہیں سمجھا۔ بلکہ یوں لگتا ہے جیسے اس عہد سے ہم خود گزر رہے ہیں۔ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس عہد کی تمام بڑی شخصیتوں سے ملے ہیں۔ ان سے باتیں کی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی گفتار میں زندگی کی حرکت' توانائی' اور قلم کا جادو تھا۔ بولتے وقت ان کے لہجے سے ہر اس عہد کی فضا موسم اور جذبے تک مجسم ہو کر خود کو محسوس کرانے لگتے جس عہد کا تذکرہ ان کی باتوں میں آجاتا۔

مجتبیٰ حسین کی نثر بھی ایسی مخصوص لب ولہجے اور اسلوب کی حامل ہے ان کی تنقیدی آواز میں نہ تو سرسید

کے زیر اثر پیدا ہونے والے مقصدی ادب کی بے رنگی، بے لطفی ہے اور نہ محمد حسین آزاد کی وہ افسانوی فضا ہے، جو رنگین اور حسین ہونے کے باوجود کبھی کبھی علمی موضوعات کو غیر معتبر بنا دیتی ہے۔ ان کی نثر نے اردو ادب میں ایک نئے اور شگفتہ اسلوب کا اضافہ کیا ہے۔ جس میں فلسفیانہ بصیرت، نکتہ رسی کی شان اور سیاسی دیدہ وری ہے۔ ان کے اسلوب میں افسانوی دلکشی اور داستان سرائی کا حسن ہونے کے باوجود علمی موضوعات غیر معتبر نہیں ہوتے۔ مجتبیٰ حسین کی نثر میں ایک ایسی قوت ہے، جو غیر محسوس طریقے پر پڑھنے والے کو اس فضا میں لے جانے پر قادر ہے، جس نے برصغیر پاک و ہند میں قدیم اور جدید کی آمیزش سے جنم لیا تھا۔ اس فضاء میں عالمی سیاسی حالات، برصغیر کی تیزی سے بدلتی ہوئی اقدار، قومی سیاست، مشرق و مغرب کے امتزاجی رنگ سے پیدا ہونے والی نئی علمی اور ادبی روایات، تعلیم یافتہ طبقے میں جنم لینے والا سیاسی، معاشی اور سماجی شعور، نوجوانوں کے ذہنوں میں پرورش پانے والی ہیجان خیزی، آرزوئیں، امنگوں سے بھرپور زندگی، آزادی کی تمنا، آدرش، خواب سب کچھ اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ محسوس ہونے لگتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی کتاب ''نیم رخ'' کے مضامین میں ادیبوں اور شاعروں سے متعارف کرانے کا ایک انوکھا انداز پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی کہانی سنا رہے ہوں۔ ان مضامین کو پڑھتے وقت ہماری ملاقات مختلف کرداروں سے ہوتی ہے۔ یہ کردار تخیل کی مدد سے تراشتے ہوئے مجسمے نہیں بلکہ ادبی حیثیت سے وہ تاریخ ساز کردار ہیں جو تہذیبی اقدار کو بنانے یا بدلنے پر قادر ہیں۔ نیم رخ کے مضامین میں یہ کردار اپنے مکمل خدو خال، انداز و اطوار اور فنی خصوصیات کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ہم ان سے ملتے ہیں۔ انہیں سنتے ہیں اور انہیں جاننے لگتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے تنقیدی مضامین میں جہاں علم و فن سے آگاہی رکھنے والوں کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان ہے وہاں ان میں نوجوان نسل کے لئے دلچسپ کہانی کے پیرائے میں ژرف نگاہی پیدا کر کے بڑی نرمی اور محبت کے ساتھ ادب کی طرف بلانے کی ایک کوشش بھی نظر آتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کی شاعری ان کی نثر سے ذرا مختلف مزاج رکھتی ہے۔ بحیثیت مجموعی اس میں تنہائی کا احساس حاوی ہے۔ جس میں ایک دبی دبی سی آواز فانی کے اس مصرعے کے مترادف سنائی دیتی رہتی ہے۔

''جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا''

ان کی شاعری کے حوالے سے ان کی شخصیت کی کئی تہیں سامنے آتی ہیں۔ فطری طور پر وہ ایسی دنیا کے

باسی تھے جہاں فطرت اور انسان کے درمیان ہم آہنگی اور ہم رنگی نظر آتی ہے۔ جہاں انسان محبت کے سفینوں میں بیٹھ کر ہر دکھ سے آزاد رفاقت اور محبت کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہ رومانیت کی وہی لے ہے، جو اپنی ابتدائی شکل میں نیاز فتح پوری، یلدرم اور بعد میں اپنی مکمل ہیئت کے ساتھ کرشن چندر کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہے مگر اس خواہش آرزو یا تمنا میں مجتبیٰ حسین کے یہاں صرف تنہائی اور سناٹا ہے۔ ان کے ہجریہ اشعار میں اس وقت کی کمی کا مسلسل احساس رہتا ہے، جو قوت ہجر کے پس پردہ کسی کے ہونے کا احساس دلا سکے۔ ان کی ہجریہ لے میں ہجر سے پہلے بھی تنہائی نظر آتی ہے جیسے بچھڑنے والے محبوب کو بھی ان کے تخیل نے تراشا ہو۔ اب ایک بار پھر فانی کے اس مصرعے پر غور کریں۔

''جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا''

ان کی شاعری میں دوسرا حاوی پہلو غم کا تصور ہے، جس میں ضبط اور حوصلہ مندی کی آمیزش ہے لیکن مجتبیٰ حسین کی شاعری کے آغاز میں ضبط اور حوصلہ مندی کی اس لے میں کبھی کبھی فراق کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ فراق کی رومانوی فضا میں دھواں دھواں شام، حسن کی اداسی اور یادوں کے دلکش سائے مخصوص کشش رکھنے کے باوجود وہ گہرائی اور گیرائی نہیں رکھتے جو غالب یا میر کا وصف خاص ہے بلکہ جدید شعراء میں بھی یگانہ کی شاعری کی مخصوص اور محدود فضاء رکھنے کے باوجود وہ قوت رکھتی ہے، جو جذبوں کی سچائی سے پیدا ہوتی ہے۔

ہنوز زندگی تلخ کا مزا نہ ملا
کمال صبر ملا صبر آزما نہ ملا

(یگانہ)

اتنا تو زندگی کا کوئی حق ادا کرے
دیوانہ وار حال پہ اپنے ہنسا کرے

(یگانہ)

اس کے مقابلے میں فراق کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ یہ ان کے اچھے اشعار میں سے ایک ہے۔

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

یہ شعر بظاہر بہت اچھا لگتا ہے لیکن درد سے سجائی ہوئی آرٹ گیلری میں ضبطِ غم کی یہ تصویر پڑھنے والے کو زیادہ متاثر نہیں کرتی۔ اس کی وجہ غالباً شاعر کا وہ ادراک ہے جو روحانیت سے ناواقف ہونے کے باوجود جنسیات و شہوانیت میں روحانیت کا عنصر ڈھونڈ لیتا ہے، اور شاید یہی سبب ہو کہ یہ شاعری رومانیت میں غم کی آمیزش کر کے کبھی کبھی وقتی طور پر لبھانے اور مسحور کرنے کے تکنیکی پینتروں کا احساس دلانے لگتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کی ابتدائی شاعری میں بھی فراق کا یہی لب و لہجہ اور ضبط غم کی وہی کیفیت پائی جاتی ہے جس میں غم نہیں ہے لیکن ضبط غم ہے۔

اے دوست تیری پرسشِ اُلفت کا شکریہ!
کس درجہ ہے خلوص پہ مبنی تیرا کرم!
اس وقت ڈبڈبائی ہوئی آنکھ پہ نہ جا!
ہنس ہنس کہ میں نے کاٹ دیئے ہیں ہزاروں غم

تیسری اور اہم سطح ان کی شاعری میں علم و ادب، فلسفہ، زندگی کے اسرار و رموز اور سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ یہی وہ سطح ہے جو آخرکار تخلیق کار کے جینے کا سہارا بھی بنی اور ان کے اشعار میں وہ قوت پیدا کرنے کا سبب بھی جو تجربات اور فکر کی ہم آہنگی کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سہارا ان کی تلاش جستجو اور بے کلی کا مداوا نہیں کر سکا تھا۔

75ء کے بعد ان کی شاعری میں ایک نمایاں تبدیلی یہ پیدا ہوئی کہ وہ مصنوعی، عشقیہ فضا اور خود کلامی کی کیفیت سے نکل کر ایک ایسی فضا میں آ گئی جہاں ہجریہ لے میں سچائی اور غم کی صداقت نظر آتی ہے اور ان کی شاعری مکمل تنہائی سے نکل کر بیچ بیچ کے انسانوں کے درمیان سانس لینے لگتی ہے۔ اس قسم کی شاعری کی سب سے اہم اور نمائندہ نظم "سوئی سے بکٹر تک" ہے۔ ان کی یہ نظم ذات کی تکمیل کا احساس دلاتی ہے۔ جہاں دوسروں کے لئے دعائیں، روشنی، رفاقت اور رہنمائی ہے۔ اس نظم میں علم، فلسفہ اور زندگی کے تجربات سب گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں۔

ان کی شاعری میں مختلف افکار، نظریات ہیں۔ عہد حاضر کے مختلف پہلو ہیں۔ ایک سوچتا ہوا باخبر ذہن ہے۔ بعض نظموں میں فلسفے کے پیچیدہ نکات روانی کے ساتھ اشعار میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ نروان، آواگون، تقدیر، نفی کی نفی، بدھ مت، یونانی، وینس غرض مختلف افکار و نظریات اشعار کا روپ دھار کر

سامنے آتے ہیں۔

میرا مقصد ان کی شاعری پر گفتگو کرنا نہیں ہے۔ ان کی شاعری علیحدہ مقالے کی متقاضی ہے یہاں اس کا ذکر ان کی شخصیت کی وضاحت کے لئے برسبیل تذکرہ یوں ہی آ گیا لیکن ایک بات طے ہے کہ ان کی نثر شاعری کے مقابلے میں زیادہ بڑی ہے۔ حالانکہ وہ جتنا جانتے تھے اس کے مقابلے میں انہوں نے بہت کم لکھا۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہت کم بھی اپنے اندر بہت معنویت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی ان کا ایک جملہ بعض ادبی مقالوں پر بھاری نظر آتا ہے۔ اس میں مفہوم کی تہہ در تہہ پنہاں وسعتیں پڑھنے والوں کو متحیر کر دیتی ہیں لیکن جنہوں نے انہیں سنا ہے وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ ان کی گفتگو ان کی نثر اور شاعری دونوں سے بڑی تھی۔

مجتبیٰ حسین کی شاعری ہو، نثر ہو یا گفتگو، بحیثیت مجموعی ان سب میں ایک قدر مشترک ہے۔ وہ ہے آدمی کی رفاقت، محبت اور تلاشِ آدمیت لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی تلاش اور محبت میں کبھی کبھی بہت شدت آ جاتی تھی۔ احساس کی یہ شدت بالعموم زندگی کے تلخ تجربوں اور وقت کی اٹھتی بیٹھتی گرد کے ساتھ ساتھ دھندلا جاتی ہے لیکن مجتبیٰ حسین کے یہاں یہ شدت احساس نہ دھندلا اور نہ کبھی بجھنے پایا۔ انہوں نے بخاری صاحب کے انتقال پر جو مضمون لکھا تھا اس میں ایک جگہ یہ تحریر ہے۔

"بخاری صاحب کے انتقال پر میں اتنا پھوٹ پھوٹ کر کیوں رویا؟

کیا بخاری صاحب کی قربت دل کو اتنا نرم بنا سکتی ہے۔ مجھے وہاں پہنچا سکتی ہے جہاں بچپن ختم ہوتا ہے نو جوانی شروع ہوتی ہے۔"

یہ بات مجتبیٰ حسین نے بخاری صاحب کے لئے لکھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں زندگی میں جب کبھی سچ مچ کا انسان ملا وہ جذبات کی ایسی دنیا میں چلے جاتے جہاں بچپن ختم ہوتا ہے اور نو جوانی شروع ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ شدت انہیں بے انتہا Possessive بنا دیتی اور وہ یہ چاہنے لگتے کہ صرف انہیں سوچو انہیں سنو اور ان کی پرستش کرو۔ ایسے وقت ان کی گفتگو کے پس پردہ ایک نئی گونج سنائی دیا کرتی:

"اور کوئی نہیں ہے میرے سوا"

علمی اور ادبی پس منظر میں یہ شاید ان کی آگاہی کی وہ منزل تھی جس نے راہ حق کے مسافر منصور بن حلاج سے انا الحق کہلوایا تھا۔ لیکن اس شدت احساس کے تحت پیدا ہونے والے خارجی ردعمل نے ان پر

بہت منفی اثرات مرتب کئے۔ کبھی کبھی ان میں صبر و تحمل بالکل ہی ختم ہو جاتا۔ وہ اپنے رفقاء اور ساتھیوں کے ساتھ معمولی معمولی بات پر بھی غیظ و غضب کی تصویر بن جاتے اور اس قدر تلخ زبان استعمال کرتے کہ ان کے سامنے ٹھہرنا محال لگتا۔ ان کے لہجے میں چاندنی راتوں کے بپھرے سمندر کی شدت، جنون اور طوفانی راتوں کی وہ خوفناک آواز اتر آتی جس میں بجلی کی کڑک، بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور زلزلے کے آثار ملتے۔ یہ سب شاید اس لئے ہو کہ وہ کھلی کتاب کی مانند تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے چہرے پر مختلف نقاب سجانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے غصے غم، شکوک، نفرت، پسندیدگی، احترام یا عقیدت مندی کا اظہار برملا کرنے کے عادی تھے۔ ان کی یہ عادت اکثر لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے ناپسندیدگی کا جواز بھی بنی۔ اس شدت کے تحت کبھی کبھی ان کے اندر تشکیک کا رویہ بھی پیدا ہوا جو بعد میں انتہا پسندی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ انسانی رویوں کے بارے میں سوچتے وقت ان کی تخیلی پرواز ایسے ایسے گل کھلاتی کہ متحیر کر دیتی۔ وہ ذہن جو علم و ادب کا عظیم خزانہ اپنے اندر رکھتا ہو وہ اس طرح بھی سوچ سکتا ہے؟ اس بات سے شدید ذہنی اذیت بھی ہوا کرتی۔ لیکن اب گمان گزرتا ہے کہ وہ سب بھی ذہن کی وہ طلسماتی کیفیات ہی تھیں جن کو ستاروں کی گزرگاہوں کا راستہ تلاش کرنے والا انسان آج تک نہیں سمجھ سکا۔ لیکن یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اپنی تمام تر شدتوں اور انتہاؤں کے باوجود ہر ہر موقع پر وہ میر کے اس شعر کی عملی تفسیر بھی تھے

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

وہ انسانی جذبوں اور رویوں کے بہترین نباض تھے ان کی آنکھوں میں ایک ایسی ایکسرے مشین نصب تھی جو غیر مادی جذبوں کی تصویر اتارنے پر قادر تھی۔ انہوں نے حقائق اور صداقتوں کی عجیب و غریب جہتوں سے روشناس کرایا تھا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر منافقت کے انوکھے رنگوں کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ اخلاق اور محبت کے پس پردہ بد اخلاقی، حسد اور نفرت سے مسخ شدہ چہرے دیکھے تھے۔ پارساؤں کی آنکھوں میں چھلکتی خباثت سے زندگی کی بدرنگی کا نظارہ کیا تھا۔ یہی وہ تمام باتیں تھیں جن کے تحت مجتبیٰ حسین سے ادب سیکھنے کے ساتھ ساتھ میں نے نفرت کرنا بھی سیکھی اور آگے بڑھتے بڑھتے حالات کی ستم ظریفی نے علمی بحث مباحثے کو اختلافی بحث اور تلخی میں بدل دیا تھا۔ آخر میں مجتبیٰ حسین کے نظریات میں زندگی کے

متعلق Absurdity کا تصور پختہ ہوگیا۔ وہ ہر چیز سے بیگانہ نظر آنے لگے تھے۔ Absurdity کے اس احساس میں مغربی افکار کا تقلیدی رنگ نہیں تھا بلکہ حیات انسانی اور تقدیر کے بارے میں مسلسل غور وفکر اور عمومی زندگی میں لوگوں کے غیر یقینی رویوں نے اسے جنم دیا تھا۔ منافقت، جھوٹ، موقع محل کے مطابق لوگوں کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلیوں نے ان کے اندر اس کیفیت کو پیدا کیا تھا۔ جس طرح فانی ساری زندگی کسی دائمی حقیقت اور سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہے لیکن انہیں دائمی حقیقت اور سچائی صرف موت میں نظر آئی۔ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ ہر چیز ناقابل یقین ہے سوائے موت کے اور انہوں نے موت کو ہی محبوب بنا لیا۔ بالکل اسی طرح مجتبیٰ حسین کے افکار میں لایعنیت کے فلسفے نے راہ پائی (ان کی تحریریں اس سے محفوظ ہیں) کیونکہ یہی وہ حقیقت تھی جس میں انہیں کوئی سچائی نظر آئی تھی لیکن اپنے اس تصور میں وہ بہت آگے نکل گئے تھے اور یہ سوچے بغیر کہ ادب اور فلسفے میں نیم آگاہی کتنی خطرناک ہوسکتی ہے۔ نئی نسل کے سامنے لایعنیت کے اس فلسفے کو بھرپور دلائل کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ مجھے ان سے شدید اختلاف تھا۔ ہماری نئی نسل جو انتہائی ذہین اور حساس ہونے کے باوجود اچھی رہنمائی کے معاملے میں پچھلے تمام ادوار کے مقابلے میں زیادہ محروم ہے اس کے سامنے مجتبیٰ حسین کی یہ باتیں زندگی کی کوئی سمت متعین کرنے کے بجائے ان میں قنوطیت، مایوسی اور بددلی پیدا کرنے کا سبب بھی بنی۔ ان کا یہ عمل زندگی کا مثبت طرزِ عمل بہرحال نہیں تھا اور شاید یہی سبب تھا کہ ان کی تمام عملی صلاحیتوں اور ذہانت کے باوجود ان کی ذات نے ہمیشہ اندھیرے کا احساس دلایا۔ ان کی شخصیت میں زندگی کی برکتوں اور روشنیوں کی کیفیت کم ہی پیدا ہوئی۔ طویل عرصہ تک صرف انہیں سنتے رہنے کے بعد اکثر کسی تاریک عمارت میں بند ہونے کا احساس ہونے لگا تھا جس میں روشنی اور ہوا کا گزر تک نہیں تھا۔ اس عمارت میں چاروں سمت پرانی کتابوں کے انبار تھے۔ جنہیں بار بار پڑھنے سے بھی اب اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

میرے اندر یہ اکتاہٹ خالصتاً ان کے رویئے سے پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی ایک بڑی وجہ خارجہ حالات میں وہ بے ہنگم صورت حال بھی تھی جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے اور جس کے سبب میری سوچ اور ذہانت کو گھن لگنا شروع ہوگیا تھا۔ لوگوں کی فطرت کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے کرتے مجھے اس حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ مجتبیٰ حسین کے ساتھ بیٹھنے کے باعث گرد وغبار کا ایک طوفان ہے جو پارساؤں کے ذہنوں میں پرورش پا رہا ہے۔ لوگوں کی منفی سوچ نگاہوں میں تمسخرانہ مسکراہٹ بن کر جھلکنے لگی

تھی۔ میری حد سے بڑھی ہوئی حساسیت اور قوت ادراک نے باوجود کوشش کے مجھے لوگوں کے حماقت آمیز رویوں سے بے نیاز نہیں رہنے دیا اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ مجتبیٰ حسین کی تند خوئی لوگوں کی میلی سوچ اور شدید ذہنی دباؤ کے تحت میرے اندر بھی ترش روئی اور تند خوئی پیدا ہوگئی اور میں نے محسوس کیا کہ منافقوں سے نفرت کرتے کرتے مجتبیٰ حسین سے بھی شدید نفرت کر رہی ہوں۔ آخر میں میرا رویہ ان کے ساتھ بے حد تلخ ہوگیا تھا۔ میری گفتگو میں ذہانت کی جگہ بدتہذیبی اتر آئی تھی۔ ذرا سی بات پر میری زبان کانٹوں کا جھاڑ بن جاتی۔ وہ مجتبیٰ حسین جن کی آواز مین طوفان کی شدت اور روانی تھی اب مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرنے لگے تھے۔ ان کے غم وغصہ اور لہجے کا طوفان خاموش ہوگیا اب اس میں ویرانیاں اتر آئی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک حادثے کا شکار ہوکر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ اب غور کرتی ہوں تو مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ نہ وہ ناگواریاں یاد رہیں جو ان کی تلخی اور تند خوئی سے کبھی پیدا ہوئی تھیں۔ نہ وہ خوشگوار لمحات یاد ہیں جو ان کی علمی، ادبی اور شجر سایہ دار شخصیت کے زیر سایہ گزرے لیکن ان کا ایک سوال آج بھی کبھی کبھی یاد آتا ہے۔ وہ سوال جسے میں نے اس وقت کوئی اہمیت نہیں دی تھی آج درد کی لہر بن کر ذہن میں کروٹیں بدلتا ہے۔ یہ سوال انہوں نے اپنے آخری دنوں میں مجھ سے کیا تھا۔

''آپ نے میری بعد کی غزلیں مجھ سے نہیں مانگیں؟''

ان کی دی ہوئی ڈائری جو 28 فروری 81ء کے بعد خاموش ہے۔ اسے دیکھ کر ان کا سوال بار بار ذہن میں گونجتا ہے اور یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ان کی شاعری میں 75ء کے بعد جو تبدیلی آئی تھی اس نے 81ء کے بعد کون سا رنگ اختیار کیا ہوگا؟ لیکن اس وقت میرے ذہن کی جو کیفیت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے اس سوال کے بعد بھی میں نے انہیں ڈائری دے کر بعد کی غزلیں نہیں لکھوائی تھیں۔ اس کی وجہ اس بے حسی کے علاوہ جو لوگوں کی مبتذل سوچ کے ردعمل سے پیدا ہوئی، میرے اپنے حالات اور موت کی وہ ستم ظریفیاں بھی تھیں جن کے تحت ایک ہی سال میں نومولود بیٹے کی موت، پھر ماں کی جدائی اور رفیق زندگی کی مفارقت نے پے در پے ایسے زخم لگائے تھے کہ میں حیران وششدر زندگی کے اس رویئے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو اس نے اچانک ہی میرے ساتھ تبدیل کیا تھا۔

زندگی کے وہ تجربات جو کچھ عرصہ قبل ہی موت کے بھیانک اور خونخوار حوالے سے مجھے ہوئے تھے

اس کے بعد مجتبیٰ حسین کی موت میرے لئے کسی قسم کے ردعمل کا سبب نہیں بن سکتی۔ بلکہ ایسا لگا جیسے پسماندہ ذہنوں کے سبب پیدا ہونے والی بہت سی الجھنیں اور پیچیدہ گتھیاں خود بخود سلجھ گئی ہوں۔

آج اتنا عرصہ گزرنے کے بعد جب ہر قسم کی دھند چھٹ چکی ہے اور میں اس قابل ہوں کہ ہر چیز کا تجزیہ کر کے ہر خوبی اور خامی کے محرکات کا اندازہ لگا سکتی ہوں تو مجتبیٰ حسین کی شخصیت کی تمام کمزوریاں بہت چھوٹی اور بے معنی نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر خالص انسان اور خالص ادب کے آدمی تھے۔ ادب کو جس انداز سے انہوں نے سمجھا تھا وہاں تک رسائی بہت کم لوگوں کے نصیب میں آئی ہوگی۔

مجتبیٰ حسین۔ شخصیت اور ادبی خدمات

فوزیہ وحید متعلم ایم اے (اردو)
پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج، لاہور

سید مجتبیٰ حسین یکم جولائی ۱۹۲۲ء کو ضلع جونپور (یو۔ پی) تحصیل شاہ گنج کے ایک چھوٹے سے گاؤں سنجر پور میں پیدا ہوئے۔

پروفیسر سید مجتبیٰ حسین کے دادا کا نام عبداللہ تھا۔ زمینداری کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازمت کرتے تھے۔ وہ صدر قانون گو تھے۔ عبداللہ مرحوم کو خطاطی میں کمال حاصل تھا۔ خاص طور پر خطاطی کی ایک بیحد پیچیدہ قسم کی طغریٰ نویسی میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ ان کا انتقال مجتبیٰ حسین کے ایام طفولیت میں ہوا۔

عبداللہ مرحوم نے اولاد کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی لی۔ عربی، فارسی کی طرف راغب کیا۔ ان کے بڑے صاحبزادے سید باقر حسین زیدی تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے بی۔ اے تک پہنچے۔ انہوں نے الٰہ آباد میور سینٹرل کالج (الٰہ آباد یونیورسٹی کا پہلے یہی نام تھا) سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس بیوی کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام سید مصطفیٰ حسین زیدی تھا۔ سید باقر حسین زیدی کی دوسری شادی قمر النساء بیگم سے ہوئی جو ضلع فیض آباد کے ایک نہایت معزز سادات رضویہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے خاندان کے لوگ زمینداری کرتے تھے لیکن علم و ادب کی روشنی سے ان کا گھرانہ منور تھا۔ شعر و شاعری سے شغف اور دلچسپی تھی یہی وجہ تھی کہ قمر النساء بیگم شعر و سخن کا نہایت عمدہ ذوق رکھتی تھیں اور موزوں طبع تھیں۔ سید مجتبیٰ حسین ان ہی کی اولاد ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے والد عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں درجۂ کمال رکھتے تھے انگریزی ادب کا خاصا وسیع مطالعہ کر رکھا تھا۔ فارسی اور اردو شعر و ادب سے بہت لگاؤ تھا۔ شعر و شاعری کے سلسلے میں نہایت خوش مزاق تھے۔

علم و ادب سے شوق اور رغبت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ انہوں نے جیمس فریزر (James Frazer) کی کتاب گولڈن باؤ (Golden Bow) کا اردو ترجمہ شروع کیا اور ایک عرصے تک اس کام میں منہمک رہے۔ ترجمہ مکمل ہوا لیکن اشاعت کی نوبت نہ آئی اور تلف ہوگیا۔ سید باقر حسین نے ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔

مجتبیٰ حسین ایک علمی اور ادبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ خاندان کے ماحول میں شعر و ادب کا ذوق رچا بسا تھا۔ ان کا اپنا خاندان مالی لحاظ سے بہت آسودہ اور فارغ البال تھا۔ ہر چند کہ اس وقت تک ان کے والد ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے تھے مگر گھر پر سرکاری ملازمت اور زمینداری کے اشتراک نے خوشحالی پیدا کر دی تھی۔

مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی ان سے سن میں بہت بڑے تھے اور اس وقت انکم ٹیکس آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ گھر میں مجتبیٰ حسین کے علاوہ اور کوئی بچہ نہ تھا۔ یہ اپنی ماں کی واحد اولاد تھے۔ اس لئے گھر بھر کی توجہ کا مرکز تھے۔ ان کو شدید ناز و نعم میں پالا گیا۔ ان کا بچپن فارغ البالی، عیش و آرام سے گزرا۔

ایامِ طفولیت گاؤں میں گزرے۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''میری پیدائش ایک ایسے گاؤں میں ہوئی تھی جہاں کھیتوں اور باغوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ زیادہ تر آموں کے باغ تھے اور آموں کے موسم میں ہمارے گاؤں کی فضائیں آموں کی خوشبو سے معطر ہو جاتی تھیں ہمارے گاؤں کے کچھ لوگ سرکاری ملازمت کرتے تھے اور کچھ لوگ کھیتی باڑی۔ والد صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کا اکثر دوسرے شہروں میں تبادلہ رہتا تھا۔ جب تک گاؤں میں رہا مجھے جنوں، چڑیلوں، بادشاہوں اور شہزادوں کی کہانیاں سننے کا بڑا شوق رہا۔ شاید ان کہانیوں کا اثر تھا کہ کبھی کبھی کسی کو دیکھتا تو وہ مجھے جن بھوت دکھائی دینے لگا اور کبھی کسی عورت کو دیکھتا تو وہ چڑیل نظر آتی۔ لیکن انہیں دیکھ کر مجھے ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔''

بچپن میں مجتبیٰ حسین کو دوسروں کی نقلیں اتارنے کا بے حد شوق تھا ان کا یہ شوق ان کی ذہانت اور گہرے مشاہدے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہمارے گھر میں نیا نیا گراموفون آیا۔ اس پر کھلے منہ کا بھونپو فٹ تھا اس گراموفون پر ریکارڈ رکھا جاتا اور چابی دے کر چلایا جاتا تو بھونپو سے آواز نکلتی تھی۔ سارے گاؤں کے جوان اور بوڑھے گراموفون سننے کے لئے ہمارے یہاں جمع ہوتے تھے۔

مجتبیٰ حسین بچپن ہی سے نڈر، بے خوف اور جرأت مند تھے۔ انہوں نے بتایا۔

''سانپ کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ لہٰذا سات سال کی عمر میں نے ہاتھ میں لاٹھی پکڑی۔ سانپ ہمارے علاقے میں کثرت سے ہوتے تھے جہاں سانپ دیکھا بڑی مہارت سے اس پر لاٹھی ماردی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے دس سال کی عمر تک بے شمار سانپ مارتھے''۔

بچپن میں جسمانی ورزش کے لئے جو کھیل کھیلے ان میں ہاکی، کبڈی اور کشتی شامل ہیں۔ ہاکی ہمیشہ سنٹر فارورڈ کی پوزیشن پر کھیلتے تھے۔ اس وقت پانچویں، چھٹی جماعت میں تھے۔ دوسرے کھیلوں کے بارے میں انہوں نے تحریر کیا کہ ''کبڈی مسلسل کھیلی، کشتی لڑنے کا جنون اس حد تک تھا کہ شادی کے روز برأت دلہن کے گھر جانے کو تیار تھی اور میں اکھاڑے میں کشتی لڑ رہا تھا مجھے زبردستی اکھاڑے سے گھر لے جایا گیا۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین کی ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بچپن بڑے بھرپور طریقے سے گزارا۔ ان کا بچپن رعنائی، دلکشی اور لطف اندوزی کا ایک حسین امتزاج تھا جس میں رنگ ہی رنگ تھے اور جو دھنک کی طرح رنگین اور دلکش تھا جس میں بے فکری اور فراغت تھی۔ اس سے ان کی طبیعت کی رومانیت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے ابتدائی تعلیم اس گاؤں سے حاصل کی۔ جہاں ان کے بچپن کا بیشتر حصہ گزرا ان کا کہنا ہے:

''بچپن کا ابتدائی حصہ گاؤں میں گزرا۔ گاؤں کے استاد تختی لکھنے پر بہت زور دیتے تھے۔ میں نے تختی لکھنے کی اتنی مشق کی ہے کہ آج تک خوش خط لکھتا ہوں۔''

اس کے بعد تعلیم جونپور اور جھانسی میں ہوئی۔ مجتبٰی حسین جونپور کے مشن ہائی اسکول میں تیسری جماعت میں داخل ہوئے اور آٹھویں جماعت تک وہیں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ نویں جماعت میں جھانسی کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ اور میٹرک تک اسی اسکول میں زیر تعلیم رہے۔ جھانسی آنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ان کے بڑے بھائی ملازمت کرتے تھے۔ بھائی نے مجتبٰی حسین کو ہمیشہ سگے بھائی سے بڑھ کر چاہا اور ان سے چاہت، محبت اور شفقت کا ایسا سلوک روا رکھا کہ وہ ضد کر کے والد کی اجازت سے ان کے پاس جھانسی آ گئے اور اپنی اسکول کی بقیہ تعلیم جھانسی میں مکمل کی۔ میٹرک کا امتحان انہوں نے ۱۹۳۵ء میں سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔

مجتبٰی حسین کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور ترقی میں ان کے والد سید باقر حسین زیدی کا بہت ہاتھ ہے۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی قریبی شخصیتوں سے نہ صرف متاثر ہوتی ہے بلکہ اپنے کردار، سیرت اور شخصیت کی تکمیل اسی نہج اور اسی انداز سے کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مجتبٰی حسین کے والد کا ان پر بہت گہرا اثر تھا۔ والد نے ہی انہیں انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا اور انگریزی ادب سے بچپن ہی میں متعارف کروایا۔ والد سے بچپن میں انگریزی ادبیات کی مشہور کہانیاں اور داستانیں سنیں۔ اس طرح سید باقر حسین زیدی اپنے بیٹے سے انگریزی ادب کا ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے فارسی زبان و ادب پر بھی توجہ دی۔ شیخ سعدی کی حکایات والد ہی سے پڑھیں اور سنیں۔ مجتبٰی حسین بتاتے ہیں۔

"میں نے نو سال کی عمر میں شیخ سعدی کی کتاب گلستان پڑھ لی تھی۔"

بچپن میں انہوں نے بچوں سے متعلق ادب کی مشہور کہانیاں بھی پڑھیں، لکھتے ہیں:

"سند باد جہازی اور حاتم طائی کی کہانیاں بھی بڑے شوق سے پڑھیں۔"

اس کے علاوہ انہوں نے ظفر عمر اور فیاض علی کے مقبول عام ناول بھی نہایت ذوق و شوق سے پڑھے۔ ظفر عمر کے جاسوسی ناول نیلی چھتری اور بہرام کی واپسی اور فیاض علی کے ناول انور اور شمیم کا مطالعہ کم عمری میں ہی کر لیا تھا۔ مجتبٰی حسین نویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے اردو کی بیشتر معروف ادبی کتابیں پڑھ چکے تھے۔ یہ وہ کتابیں تھیں جو اس دور میں نہ صرف شہرت عام کی حامل تھیں بلکہ آج

بھی ان کا مطالعہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے کیا جاتا ہے۔ ان میں محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' مولانا شبلی نعمانی کی ''موازنہ انیس و دبیر'' مولانا الطاف حسین حالی کی 'یادگارِ غالب'' اور مقدمہ شعر و شاعری' ڈپٹی نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر کے ناول بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ شرر کا رسالہ 'دلگداز' بھی ان کے گھر میں باقاعدگی سے آتا تھا۔ اس کی تمام فائلیں گھر میں موجود تھیں مجتبیٰ حسین کے مطالعہ میں وہ بھی آئیں۔ ان بیش قیمت کتابوں سے مجتبیٰ حسین نے بڑے اثرات قبول کئے ہیں۔ خاص طور پر محمد حسین آزاد کے اندازِ نگارش اور ان کی کتاب ''آبِ حیات'' نے بڑے ان مٹ نقوش مرتب کئے۔ مجتبیٰ حسین کے اسلوب پر اس کی گہری چھاپ نظر آتی ہے اور ان کی کتاب ''نیم رُخ'' پر آبِ حیات کے بہت سے اثرات ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے ذوق شعری کی تعمیر میں جھانسی کی پبلک لائبریری ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ یہ لائبریری بلند پایہ اور نادر کتابوں سے مالامال تھی۔ اس دور میں چھپنے والے تمام ادبی رسائل و جرائد باقاعدگی سے اس کی زینت بنتے تھے۔ ان میں خاص طور سے صلائے عام (میر ناصر علی)' مخزن (شیخ عبدالقادر) نگار (نیاز فتحپوری)' الہلال (ابوالکلام آزاد)' قابل توجہ ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے کتابوں کے ساتھ ساتھ ان رسائل کے مطالعے سے بھی اپنی ادبی معلومات میں بیشتر قابل قدر اضافے کئے اور انہیں اس وقت کے شعری و ادبی میلانات اور رجحانات سے آشنائی ہوئی۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''نگار'' کا التاسیدھا مطالعہ تو میں نے نویں جماعت سے شروع کر دیا تھا میں اس زمانے میں گورنمنٹ کالج جھانسی میں پڑھتا تھا۔ جھانسی چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے مگر وہاں کا کتب خانہ بالخصوص اردو کا حصہ ''بھرا پرا'' ہے۔ پرانی کتابوں اور پرانے رسالوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ اپنی بساط کے مطابق نگار کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا جو کچھ سمجھ میں آجاتا اس سے بھی اور جو کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس سے بھی ایک خاص قسم کا جذباتی اور رومانی حظ حاصل ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے میں کسی اجنبی شہر میں آگیا ہوں۔ جہاں اجنبی زبان میں عشق و محبت کی داستان چھڑی ہوئی ہے۔ قدیم تاریخ کے دھندلکوں سے بہت سے حسین چہرے جھانکتے ہوئے معلوم ہوتے۔ یہ چہرے کبھی نجد کے ریگستان میں دکھائی

دیتے کبھی یونان میں۔ اس رومانی ''امتزاد'' سے ہٹ کر مجھے نگار کی وساطت
سے ایک اور چیز بھی مل رہی تھی جسے میں خود سے بھی چھپانے کی کوشش کرتا۔ وہ تھی
عام طرز فکر سے ہٹ کر سوچنے کی جرأت یا یوں سمجھئے کہ گستاخی۔ اس وقت میں
اسے گستاخی ہی سمجھتا تھا۔ نگار کا مطالعہ برابر جاری رہا اور میں اس کے ذریعہ سے
نئے پرانے دونوں قسم کے لکھنے والوں سے روشناس ہوتا رہا۔''

مجھے یہاں علامہ اقبال جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی اور سیماب اکبر آبادی کے کلام کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس مطالعہ نے ان کے ذہن پر نہایت خوشگوار اور وقیع اثرات مرتب کیے۔ اسی مطالعہ نے آگے چل کر ان میں شعورِ نقد پیدا کیا۔

بی اے میں ٹیٹوریل میں فراق گورکھپوری جیسے قابل، نامور اور ادب شناس استاد کے پاس تھے ان کی شاگردی میں مجتبیٰ حسین کے ذہن کو مزید جلا ملی اور ادب کے بہت سے پیچیدہ، پوشیدہ اور مخفی نکات واضح ہو کر جھلملاتی روشنیوں کی طرح ان کے سامنے آئے۔ ان کے فارسی کے استاد ڈاکٹر زبیر اور فلسفہ کے استاد ڈاکٹر مکرجی تھے۔ بی اے کا امتحان ۱۹۴۳ء میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ قاعدے کی رو سے ۱۹۴۲ء میں کر لینا چاہیے تھا لیکن اسی دوران سیاست میں دلچسپی کی وجہ سے سیاسی تحریک ہندوستان چھوڑ دو میں حصہ لیا۔ جماعت میں حاضری کم ہو گئی۔ کمرۂ امتحان میں نہ بیٹھ سکے۔ اس تعلیمی عرصے میں گیان چند جین، بلونت سنگھ اور پریم چند کے چھوٹے صاحبزادے ان کے کلاس فیلو تھے۔

ایم اے میں اردو کا مضمون لیا جو اردو شعر و ادب سے ان کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شعبہ اردو کے اساتذہ میں صدر شعبہ اردو پروفیسر ضامن علی، ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر حفیظ سید سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اور ان کے علم، مطالعہ اور تجربے سے خوب استفادہ کیا۔ ایم اے کا امتحان ۱۹۴۵ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ زبانی امتحان پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لیا جو اردو مزاح نگاری میں اپنے منفرد اور خاص رنگ کی بنا پر اونچا مقام رکھتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کو یونیورسٹی میں آنے کے بعد سیاسی تحریکوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس وقت تک برطانیہ کے خلاف جدوجہد کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور اس کے شعلے آسمان تک جا رہے تھے۔ اس۹

وقت برصغیر کی فضا اپنی کہنہ آشامی کے بوسیدہ لبادے اتار رہی تھی اور اس فضا میں ایک بہت ذہین طالب علم کی آنکھیں اپنے ذہنی افق کو متعین کر رہی تھیں۔ اس افق پر عہدِ فرنگ کی روشنی کم ہو رہی تھی اور جدوجہد آزادی کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

مجتبیٰ حسین کو بہت سے سیاسی لیڈروں کو سننے کا موقع ملا اور اس طرح ان کے اندازِ خطابت سے واقفیت ہوئی۔ انہوں نے سبھاش چندر بوس کی شعلہ بیانی سنی' ابوالکلام آزاد کی گرج کانوں میں پڑی اور حسرت موہانی کی سنسناتی مگر دلوں میں بیٹھتی آواز سنی۔

مجتبیٰ حسین کے جوش ملیح آبادی سے بہت زیادہ قریبی تعلقات تھے اور ان سے اتنا قریب کوئی اور نہ تھا جتنے مجتبیٰ حسین تھے۔

مجتبیٰ حسین نے اسی دوران میں بہت سے مرثیہ خوانوں کو مرثیے پڑھتے سنا۔

نئی دنیا کے خواب دیکھنے والے تازہ دم جوان فکر ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ سامنے آچکا تھا۔ ان میں پروفیسر احتشام حسین' پروفیسر آل احمد سرور' پروفیسر فراق گورکھپوری' مجاز' جذبی' فیض احمد فیض' احمد ندیم قاسمی' روشن صدیقی' جان نثار اختر' عصمت چغتائی' راجندر سنگھ بیدی' کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو شامل تھے۔ اس کے بعد کی نسل میں اختر الایمان' ساحر لدھیانوی' قرۃ العین حیدر' سلام مچھلی شہری' عزیز حامد مدنی' ممتاز حسین' محمد حسن عسکری' شوکت صدیقی' کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری وغیرہ تھے۔ مجتبیٰ حسین کا تعلق کم و بیش اسی نسل سے ہے۔

مجتبیٰ حسین کی شادی ان کے ماموں کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان کے ماموں سید فقیر حسین علم و ادب سے محبت رکھتے تھے اور خود بھی ایک اچھے شاعر تھے لہٰذا ان کی صاحبزادی پر بھی ان کا اثر ہوا یہ والد ہی کی تربیت تھی کہ صاحبزادی کا ذوقِ سخن بھی بہت اعلیٰ درجے پر پہنچا ہوا تھا۔ مجتبیٰ حسین کی بیوی شعر و شاعری کی دلدادہ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ موزوں طبع ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے ۱۹۴۵ء میں ایم اے کرنے کے بعد سرکاری ملازمت سے بچنے اور فکری آزادی اور کچھ ادب اور زندگی دونوں کے ربط برقرار رکھنے کے لئے فراق گورکھپوری کے ساتھ ''سنگم پبلشنگ ہاؤس'' الٰہ آباد میں قائم کیا۔ اس مکتبے کو قائم کرنے اور چلانے کے لئے تمام روپیہ مجتبیٰ حسین نے لگایا۔ فراق صاحب کی بیشتر کتابیں اسی ادارے نے شائع کیں۔ فراق گورکھپوری'

بلونت سنگھ، تیغ الہ آبادی (مصطفٰی زیدی) کی کتابیں بھی اسی مکتبے سے شائع ہوئیں۔ ۱۹۴۵ء میں کچھ سنگم پبلشنگ ہاؤس کی کتابوں کی فروخت اور زیادہ تر 'بمبئی'' دیکھنے کے شوق میں بمبئی چلے آئے یہاں تقریباً دو سال تک مقیم رہے۔ بمبئی آنے سے پیشتر سنگم پبلشنگ ہاؤس کو اپنے جگری دوست رئیس احمد رزاقی کے سپرد کیا۔ بمبئی میں قیام کے درمیانی عرصے میں الہ آباد آتے جاتے رہے۔ یہاں کچھ عرصہ پڑھانے کی ملازمت کی اور انجمن اسلام ہائی اسکول میں مدرس رہے۔ کچھ عرصہ کارگزارا، اس کے بعد فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے اور ایک صاحب کے ساتھ مل کر فلم اسکرپٹ پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے گاؤں لوٹ آئے۔ یہ دور اُن کی زندگی کا بہترین دور تھا۔ گھر پر فراغت، خوشحالی اور آسودگی تھی۔ مالی طور پر بہت مستحکم تھے لہٰذا فکر معاش سے آزاد رہے۔ والد کی چھوڑی ہوئی جائیداد اور جمع شدہ روپیہ مجتبٰی حسین کے نام تھا اس لئے مالی پریشانیوں سے دور رہے اور اس قسم کی فراریت اور رومانیت کے متحمل ہو سکتے تھے۔

سنگم پبلشنگ ہاؤس چند سالوں تک اچھا کام کرتا رہا مگر تقسیم ہند کے بعد بیٹھ گیا اور مجتبٰی حسین کو صرف گھاٹا ملا۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء کے آخر میں مستقل طور پر پاکستان آئے۔ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرتے وقت اپنے ساتھ گھر سے کوئی اثاثہ نہ لائے یہاں مدتوں ٹھوکریں کھاتے رہے ابتدا میں رہنے کا کوئی ٹھکانہ بھی نہ تھا۔ آخر کار شمالی ناظم آباد کراچی میں ۲۱۹ رسی ڈی بلاک میں رہائش پذیر ہوئے۔ تمام جائیداد ہندوستان میں ہی تھی اور روپیہ پیسہ بھی پاکستان نہیں لائے تھے لہٰذا یہاں آ کر حصول ملازمت کے لئے کوشش کرتے رہے لیکن اس سلسلے میں ناکامی ہوئی۔ کسی کالج نے ملازمت نہ دی کیوں کہ نامہ اعمال سیاہ کی بجائے سرخ تھا۔

۱۹۴۵ء میں کراچی میں کچھ مدت اسکولوں میں پڑھاتے رہے پھر چینی سفارت خانے کے خبر نامے کے مدیر ہوئے یہاں تقریباً آٹھ برس تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے۔ ۷۲-۱۹۶۵ء کے دوران پہلے نیشنل کالج کراچی میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے کام کیا چار پانچ برس کے بعد سراج الدولہ کالج میں بطور صدر شعبہ آگئے اور بعد میں اس کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ ۱۹۷۳ء سے جامعہ بلوچستان میں شعبہ اردو ان کی کوششوں اور کاوشوں سے وجود میں آیا۔

آج مجتبیٰ حسین کی ۱۶ ربرس کی مسلسل اور انتھک کوششوں کے نتیجے میں جامعہ بلوچستان کا شعبہ اردو ایک روشن اور درخشاں ستارے کی مانند جگمگا تا رہا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی پرورش ایک علم دوست گھرانے میں ہوئی۔ شعر وادب سے دلچسپی ورثے میں ملی اور پھر نامور اساتذہ کی رہنمائی نے ان کے اندر علم وادب کی شمع کو روشن تر بنا دیا۔

انہوں نے آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ پہلا افسانہ ''سوچ'' تھا جو ۱۹۴۳ء میں رسالہ نگار لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ ''نگار''۔ ''ادبی دنیا'' اور ''ساقی'' میں پابندی سے لکھتے رہے۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی خاص طور پر تنقید کے میدان کی طرف توجہ دی۔ ان کا پہلا تنقیدی مضمون ''جریدہ اردو شاعری'' ۱۹۴۴ء میں رسالہ نگار لکھنؤ میں چھپا۔ اس کے بعد تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ مجتبیٰ حسین کے کئی مضامین ادبی دنیا میں بھی چھپے۔ خاص طور پر فراق اور سلام مچھلی شہری پر ان کے مضامین نے بڑی شہرت حاصل کی۔

شعر وشاعری اور ڈرامے سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ انہوں نے کئی اچھی نظمیں، غزلیں، کئی اچھے ڈرامے اور چونکا دینے والے تنقیدی مضامین لکھ کر اردو ادب میں اپنے لئے بہت جلد علیحدہ مقام بنا لیا۔

مجتبیٰ حسین قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے اور اس کے بہت سے پروگراموں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ ان کے ان گنت فیچر اور ڈرامے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر قبولیت عام حاصل کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں سید عابد رضوی لکھتے ہیں:

> ''مجتبیٰ صاحب گزشتہ چالیس برسوں سے ریڈیو پاکستان سے پروگرام نشر کر رہے ہیں اور بلاشبہ ان کی ذاتِ گرامی اس ادارے کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔''

اس ادارے سے وابستگی کے دوران میں انہوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا اور اپنی ذہنی اپج اور تخلیقی قوتوں کی بدولت یادگار پروگرام پیش کئے۔

مجتبیٰ حسین کے احباب اور ان کے نقادوں نے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تحریروں سے مجتبیٰ حسین کی ایک واضح شخصیت سامنے آتی ہے۔ ان کی شخصیت کی مختلف

جہتیں پوری طرح روشن ہو جاتی ہیں۔ عزیز حامد مدنی اور ان کی ظاہری شکل وصورت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''آنکھوں کی چمک میں ایک حریفانہ شک' لبوں کی لرزش' لکنت آمیز الفاظ کہ کسی نردبان کے گرتے گرتے زخمی ہوں۔ گندمی چہرے پر نمک' ایک شانہ ذرا جھکا ہوا' ذہن میں ایک نادیدہ ترازو کہ ملنے والے کی سکت اور علم کو تولنا چاہتا ہو۔''

عزیز حامد مدنی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے اور ان کی سیرت وکردار کے بعض مخفی پہلو سامنے لائے ہیں۔

''مجتبیٰ ایک خوش گفتار آدمی ہیں۔ بیدار مغزی ودیعت ہوئی۔ مگر جب سنجیدگی کی کلاہ و جبہ اتار کر رکھ دیتے ہیں تو ان کے اندر کا داستان سرا جاگ اٹھتا ہے۔ وہ جونا خان کے نام پر بسائے ہوئے شہر جونپور کے رہنے والے ہیں۔ جون پور سلطان حسین مشرقی کا پایہ تخت جس نے تہذیب کو۔ جون پور راگ اور رشید احمد صدیقی جیسا نثر نگار دیا۔ رات جب ذرا بھیگ جاتی تھی۔ جون پور کی چنبیلی کی مہک ان کی یادوں سے لپٹ جاتی تھی اور ایک داستان شروع ہوتی قلعہ کی' خاندان کی' صبح ہوتی جون پور میں پانچ سو قاضیوں کی پالکیاں نکلتی تھیں۔ ہمارے یہاں کی نالیوں میں چنبیلی کا عطر بہتا تھا اور جانے کیا کیا''

سید عابد رضوی لکھتے ہیں:

استاد محترم پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب سے میرا پہلا تعارف آج سے کوئی ۳۶/۳۵ سال قبل ان کی تحریریوں کے توسط سے ہوا۔ ادب و آگہی اور فراق صاحب کے ''اندازے'' وہ اولین کتابیں ہیں جن سے میں نے ادب سمجھنے کا قرینہ سیکھا۔ اس پہلے تعارف میں مجتبیٰ صاحب کی شخصیت کا ایک ہیولا میں نے تراشا۔ اپنے ذہن میں ان کا ایک خاکہ ترتیب دیا اور پھر جب برسوں بعد غالباً ۷۳۔۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ مجتبیٰ صاحب سے ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں اثر جلیلی مرحوم کے توسط سے پہلی ملاقات ہوئی...... مجتبیٰ صاحب ہو بہو میری تصوراتی شخصیت کے مطابق نکلے۔ اس میں میرے تخیل یا میری مردم شناسی کا کوئی کمال

نہیں تھا۔ یہ کمال بھی مجتبیٰ صاحب کا ہی تھا کہ جس کی شخصیت جن کی فکر اور جن کی تحریروں میں حیران کن حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ وہ جو سوچتے ہیں وہی لکھتے ہیں جو کہتے ہیں وہی لکھتے ہیں وہ قلم کی طہارت اور فکر کی صداقت کے ہر پیمانے پر اترتے ہیں۔"

پروفیسر سجاد باقر رضوی مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب بھی میرے معنوی استاد ہیں میری بنیادی ادبی تربیت انہیں کے ہاتھوں میں ہوئی میں نے کتابوں سے اتنا علم حاصل نہیں کیا جتنا ان کی گفتگو نے میرے علم میں اضافہ کیا وہ ادب کے ایسے مریض ہیں جن سے ادب کی بیماری چھوت کی طرح لگتی ہے۔ ان کی گفتگو ادب کا ایک اعلیٰ ذوق پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ادب سے گہری رغبت اور محبت پیدا کرتی ہے۔ وہ لوگوں میں ادب کے مسائل کے حل کا شعور پیدا کرتے ہیں۔ وہ ادب کے مسائل پر اتنی شدت سے بولتے ہیں کہ ایک پورا مضمون لکھا جا سکتا ہے۔"

صہبا لکھنوی مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے ایک پہلو کی اس طرح نقاب کشائی کرتے ہیں:

"مجتبیٰ حسین ادب میں سمجھوتے کے قائل نہیں، وہ اپنے نظریات میں اٹل ہیں۔ ادب میں گروہ بندی کبھی ان کا مسلک نہیں رہی۔ وہ سچی اور کھری باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ انتیس سال کی رفاقت کے دوران میں نے کبھی ان میں قلم کی حرمت کا سودا کرتے نہیں پایا......

عزیز حامد مدنی ان کی شخصیت کا ایک نقاد کی حیثیت سے تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"اردو کے جدید ادب میں معتبر ناقدین کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور یہ پاکستان اور ہندوستان میں اپنی عمروں کے لحاظ سے تقسیم کئے جا سکتے ہیں ان میں وہ ہیں جنہیں بہ لحاظ فراست و دانشوری ہمارے اساتذہ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان میں وہ ہیں جن میں اس لفظ سے جو شرمندہ تعبیر نہیں، معاصر کہہ سکتے

ہیں۔ان میں وہ ہیں جن کی یکسوئی وسعی سے تنقیدی کاوش میں ایک تسلسل کا یقین پیدا ہوتا ہے یہ عہد بہت پیچیدہ تاجرانہ یکسران مصلحتوں کو صفات میں تبدیل کرنے والا جو کل محض ایک تدبیر تھیں۔تو مجھے اسی شہر کراچی کی وہ شامیں اور راتیں یاد آتی ہیں جب طویل بحثوں میں ادب کے مختلف زاویوں میں ہماری وقیع ادبی شخصیتوں کے اختلاف میں کشادہ دلی، چشمکوں میں وسعت نظر تھی۔مجتبیٰ حسین ایسی روایات کے بہت معتبر آدمی ہیں...... عصر حاضر کی دشواریوں سے ان کی محرمانہ واقفیت ایک بڑی چیز ہے۔ادب کے اس بے پناہ انہماک کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ایک عام قاری کی حیثیت سے ان کی کتابوں کو اردو کی جدید تنقید نگاری میں اس تلاش وجستجو کی ایک پائیدار مثال سمجھتا ہوں جس کی مشرقیت کی سند کے لئے کم عمر اردو ادب میں ہی اس کی بنیادیں مل جاتی ہیں۔

پروفیسر نسیم نیشوفوز

مجتبیٰ صاحب......ایک تاثراتی ہیولا

۷۰۔۱۹۶۰ء کا زمانہ اردو ادب کا زرّیں دور تھا۔ وہ نقوش، نیرنگ خیال اور ادب لطیف، لیل و نہار، ساقی، نیا دور، ماہنامہ افکار وغیرہ کا دور تھا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کا دور تھا، قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کا دور تھا پاک ٹی ہاؤس (لاہور) کا دور تھا۔ پابلو پکاسو اور شاکر علی صاحب کا دور تھا۔ فقیر صادقین نقوی کے ابتدائی اُٹھان کا دور تھا۔

۱۹۶۰ء میں راقم الحروف نے بی۔اے میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں نیشنل کالج پی۔ای۔سی۔ایچ ایس کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں واقع ہوا کرتا تھا۔ میں اردو ادب میں یا عالمی ادب کی الف ب سے بھی واقف نہ تھی۔ متذکرہ کالج میں مَیں نے شوقیہ طور پر اردو ادب (ایڈوانس) کا نصاب لیا۔

پروفیسر حسن عادل صاحب کا نیشنل کالج کیا تھا؟ اردو ادب کا گڑھ تھا۔ پروفیسر ظفر عمیر زبیری (مورخ) پروفیسر احمد علی (ترقی پسند انگارے والے) یحییٰ سلام اللہ، مولانا حسن مثنیٰ ندوی، پروفیسر حسنین کاظمی اور مجتبیٰ حسین وہاں کے ادبی خزانے میں جمع تھے۔

معاشیات کے پروفیسر یحییٰ سلام اللہ صاحب نے میرا ایک نیم تخیلاتی انشائیہ دیکھ کر مجتبیٰ حسین صاحب سے کہا۔

"Nasim is Khalil jibran in The making."

مجتبیٰ حسین صاحب فقط مسکرا دیئے مگر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ یحییٰ سلام اللہ اور مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی سفارش پر مجتبیٰ حسین صاحب نے مجھے اپنا ''تلمیذ الادب'' بنالیا۔

میری کج فہمی کے میں سعادت حسن منٹو اور خلیل جبران کو Mix کر کے اپنے افسانے لکھا کرتی تھا۔

مجھے اس بات کا قطعاً علم نہ تھا کہ مجتبیٰ حسین صاحب ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے اور بڑے ہی روشن خیال، لہجہ دھیما، آنکھیں ہمیشہ سے چمکدار۔

مجتبیٰ حسین صاحب شاعر اور ڈراما نگار تھے۔ ان دنوں بلیک اینڈ وہائٹ ٹیلی ویژن پر ان کے ٹیلی پلے ''اہرمن'' چل رہا تھا جو گوئٹے کے ''فاؤسٹ'' سے ماخوذ تھا۔ وہ مجھے ٹی وی اسٹیشن لے گئے...... اس زمانے میں ٹی وی اسٹیشن میں انٹری بڑے کارنامے کی بات تھی۔ وہاں میں افتخار عارف، عبید اللہ علیم اور مدبر رضوی سے ملا۔

میں کبھی کبھار اپنا کچا پکا افسانہ لکھ کر مجتبیٰ صاحب کے حضور پیش کر دیا کرتا (برائے اصلاح) ہاں! میں اصل بات کہنا بھول گیا مجھے بخدا اس بات کا علم نہ تھا کہ مجتبیٰ صاحب اردو ادب کے بہت بڑے نقاد تھے۔ پورے برصغیر میں ان کا چرچا تھا۔

پھر انہوں نے مجھے ماہنامہ افکار کے اشاعت گھر سے شائع شدہ اپنی پہلی کتاب ''تہذیب و تحریر'' تحفتہً دی۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے وہ کتاب پڑھنے کی کوشش کی۔ ان کی کتاب کا ایک خیال انگیز موضوع تھا ''ادب کا مستقبل۔''

مجتبیٰ صاحب نے بنیادی سوال یہ اٹھایا تھا کہ عالمی ادب تک ''بڑا ادب'' پیدا نہیں کر رہا ہے۔ ہرمن ھیسے Hess کیوں خاموش بیٹھا ہوا ہے؟ ٹاس مان T.Manan میجک ماؤنٹین کے بعد کوئی بڑی کہانی کیوں نہیں لکھ پایا۔

ھرمن ھیسے، سارتر، کامو، ٹامس مان، آندرے ماژید...... یا خدایا یہ کیسا ادبی بھنور ہے۔ جس سے میں بالکل ناواقف ہوں۔

پھر نیشنل کالج کے صدر دروازے سے نکلتے ہوئے مجتبیٰ صاحب نے فرمایا

''تم ورجینیا وولف Virginia Wolf کی Common Reader پڑھو وہ بڑی ہی اچھی جمالیاتی نقاد ہے اور ناول نگار بھی...... ''لفظ جمالیات سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

میرے ذہن میں یہ سوال اٹھا۔

''یا خدا! یہ تنقید کیا چیز ہے؟''

نقد و بصر کا افسانے سے کیا تعلق ہے؟ شاعری سے کیا رشتہ ناطہ ہے؟

اس کے بعد مجتبیٰ صاحب نے نیشنل کالج اور لائبریری سے منشی پریم چند کے ناول ''میدان عمل'' اور ''گئودان'' پڑھنے کے لیے دیئے۔

یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ مجتبیٰ صاحب نے مجھے کبھی روسی ادب یا کارل مارکس پڑھنے کی ترغیب نہیں دی۔ وہ فرانسیسی ادب کے بڑے گرویدہ تھے۔

بہر طور میری علمی و ادبی تربیت ہوتی رہی! مجھے آج تک یہ گمانِ احسن ہے کہ میں مجتبیٰ صاحب کا پسندیدہ طالب علم ہوا کرتا تھا۔

درحقیقت مجتبیٰ صاحب مجھے بہت بڑا ترقی پسند ادیب بنتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے 'فن برائے زندگی' کا ادراک کروانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے تئیں مجھ سے حقیقت نگاری کے کڑوے کسیلے مسائل پر لکھوانا چاہتے تھے۔

ادھر میں چھوٹے موٹے صنعت کار باپ کا بیٹا ہونے کے ناتے زندگی کے چہار سو رومانویت ہی رومانویت دیکھنے کا قائل تھا یعنی حسن ہی حسن جہاں تک نگاہ ڈالو۔ انہی کے بے حد اصرار پر میں نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا۔

ویسے میری نظر میں مجتبیٰ صاحب کامل ترقی پسند ہونے کے باوجود از حد رومانیت اور جمالیت پسندانہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی تقریباً سبھی تحریریں جمالیت پسندی کا اعلیٰ مرقع تھیں۔

مثال کے لئے میں ایک مضمون کا خصوصی حوالہ دینا پسند کروں گا وہ مضمون ہے ''مسجدِ قرطبہ''۔

علامہ اقبال کی مسجد قرطبہ پر مجتبیٰ صاحب نے یوں لکھا جیسے وہ کسی جمال پرست Architect کی طرح اینٹ در اینٹ کی بنیاد رکھ رہے ہوں۔ ایمان افروزی کے ساتھ' روحانی عقیدت کے ساتھ' جمالیاتی و وجدانی چمک دمک کے ساتھ۔

ان کی مسجد قرطبہ لکھنے کا انداز بڑے بڑے ماہرین اقبالیات پر فائق ہے۔ مذکورہ مضمون ہمارے ذوق سلیم کی جمالیاتی تشفی و تسکین کا ضامن ہے۔ بلاشبہ متذکرہ مضمون اردو ادب کا بہت بڑا سنگ میل ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب مصور/ سنگ تراش آذر زوبی کے بھی بڑے اچھے دوست تھے اور زوبی صاحب کے بے حد اصرار پر نہایت خوبصورت ادبی رسالے ''شعور'' کی ادارت بھی کیا کرتے تھے۔ غالباً بلا معاوضہ......

اسی زمانے میں مَیں نے اپنے انشائیوں کی کتاب ''انفس و آفاق'' تحریر کی اور مجتبیٰ صاحب نے اس

پر پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی۔

یہ بات کہتا چلوں کہ اس بڑے ادبی دور میں نامی گرامی نقاد گمنام ادیبوں اور شاعروں پر دیباچے نہیں لکھا کرتے تھے۔ مجتبیٰ صاحب نے پہلے نیم انکار کیا۔ پھر دو تین ہفتوں بعد ان کے موڈ میں کیا چیز سمائی مجھ سے فرمایا۔

''کاغذ اور قلم لے کر آؤ۔ فوراً''

میں نے حکم کی تعمیل کی۔

انہوں نے لکھا:

رنگوں، لفظوں اور لکیروں کے ذریعے سے زندگی طویل سفر طے کرتی رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ رنگ، لفظ اور لکیر حقیقت ہے یا حقیقت کا مظہر ہے اور پھر زندگی کیا ہے؟ خالق یا مخلوق، قدیم یا حادثہ! وجود سے زندگی ہے یا زندگی سے وجود۔''

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''روح اور مادّہ، جسم اور ذہن، اَنا اور مجتمع، ماضی، حال اور مستقبل...... یہ تقسیم حقیقی ہے، تصوّراتی ہے، تخیلی ہے یا عارضی۔ اگر حقیقی ہے تو درد، درد ہجر، انسان، خالق، کائنات...... یہ سب منقسم تصورات ہیں۔''

مجتبیٰ حسین

۲۴ر جون ۷۳ء

سراج الدولہ کالج کریم آباد۔ کراچی

مجتبیٰ صاحب سراج الدولہ کالج میں اردو ادب کے پروفیسر تھے۔ میں نے ان کے حضور جا کر اپنی مزید علمی استعداد بڑھائی۔

اسی کالج میں عظیم شاعر جناب عزیز حامد مدنی سے بھی متعارف ہوا (دوپہر) درس و تدریس کے بعد وہاں ادبی محفل جم جایا کرتی تھی۔ Main Poet عزیز حامد مدنی ہی ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھار میں اپنی انگریزی نظمیں پڑھا کرتا تھا۔

مَیں نے مجتبیٰ حسین صاحب کو بتلایا کہ میری انشائیوں کی کتاب پاکستان کی ادبی مارکیٹ میں فلاپ ہوگئی ہے۔ اُن کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔

میں بہ حیثیت پاکستانی ادیب ناکام تھا' فیل تھا' فلاپ تھا البتہ عزیز حامد مدنی صاحب کی ہمت افزائی کی بدولت میں ریڈیو پاکستان کا چھوٹا موٹا ڈرامہ نگار ضرور بن گیا۔ (یہ شاید جملۂ معترضہ ہو کہ بہت بعد میں جا کر میں نے قومی ایکسیلینٹ ایوارڈ برائے ۱۹۹۹ء۔۱۹۹۸ء جیتا)

اس سال دوسرے بڑے نام اشفاق احمد' بانو قدسیہ اور فاطمہ ثریا بجیا کے تھے) کہنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ مجتبیٰ صاحب کے کہنے پر اگر میں ولیم شکسپیئر' برنارڈ شا' ایوین اونیل' موریس میٹرلنگ وغیرہ کو نہ پڑھتا تو ڈرامہ نویسی کی جانب شاید کبھی نہ آتا۔

پھر میں نے اپنی دوسری روحانی انشائیوں کی کتاب اسمِ ذات یعنی اللہ مکمل کی۔

حسب سابق مجتبیٰ صاحب نے میرے لیے ایک دیباچہ بعنوان 'داستان ہجر و وصال' تحریر کیا۔ ایک مختصر مگر خیال انگیز دیباچہ۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ جو تاریخ بکھری پڑی ہے' یہ جو متعدد اساطیری سیڑھیوں سے اتر کر آدمی اسباب و علل کے دائروں میں آ گیا ہے۔ وہ کب تک موٹر کے ٹائر کی طرح انہیں دائروں میں گھومتا رہے گا۔ یہ ٹائر ان گنت دائرے بناتے ہوئے کہاں جا رہے ہیں۔ مگر کہاں؟

کیا یہ تمام دائرے جو تعینات کئے ہیں۔ کیا ایک بڑے اور فائنل دائرے میں سما کر از خود پگھل نہ جائیں گے۔

یہ بڑی الجھنوں کے سوال اور مسائل ہیں......"

مجتبیٰ حسین

۲۵/اپریل ۱۹۸۵ء

مَیں سمجھتا ہوں مجتبیٰ حسین صاحب ایک بڑے نقاد ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک بڑے فلسفی بھی تھے۔ نصابی فلسفی نہیں بلکہ ایک Pragmantic فلسفی۔

ان کا فلسفہ حیات 'صداقت اولےٰ' کی تلاش تھا۔ وہ درویشانہ انداز موج میں آ کر کہتے۔

"نیشوفوز! کبھی کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ گیروا لباس پہن کر...... جٹا دھاری جوگی بن کر ان دیکھے جنگلوں میں کھو جاؤں۔"

کبھی کبھی فلسفۂ ویدانت اور قدیم رشی منوں کے ذکر کر بیٹھتے۔

اور کبھی کبھار یہ سمجھانے لگتے کہ ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اپنی معروفِ زمانہ ویسٹ لینڈ میں لفظ شانتی کیوں استعمال کیا۔

مجتبیٰ صاحب کے دو لفظ بڑے پسندیدہ ہوا کرتے تھے۔

''ولی......اوتار''

ان کی پسندیدہ کتاب یعنی ناول پرل ایس بک Buck کی The Good Ealat تھی۔

مجتبیٰ حسین صاحب ترقی پسند نہیں تھے بلکہ وہ ایک جمال پرست روح رکھنے والے جوگی تھے...... بقول خود ان کے جٹادھاری جوگی...... جو پاکستانیت اور اس کی پاکیزہ ارضیت کے حوالے سے باطنی نقطۂ نظر سے ''صوفی منش'' انسان تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اور حسینیت کے عاشق مجتبیٰ صاحب کے زندگی کے آخری ایام میں اس درجے پر فائز ہو گئے تھے جو ولی اوتاروں کا اعلیٰ درجہ ہوا کرتا ہے۔

میں ان کی شخصیت کو ایسی ہستی کے طور پر مانتا ہوں جو Legend کے طور پر پہچانی جاتی ہے اور وہ Legend جو ادب اور روحانیت دونوں کا بیک وقت احاطہ کرتی ہے۔

لامحیط احاطہ!!

شفیق احمد شفیق

پروفیسر مجتبیٰ حسین کی تنقید نگاری

پروفیسر مجتبیٰ حسین کا تعلق سماجی تنقید نگاری سے ہے۔ وہ جس قافلے سے تعلق رکھتے تھے اس میں اختر حسین رائے پوری، سید سبط حسن، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر ممتاز حسین اور پروفیسر عزیز احمد بھی شامل تھے۔ نظریاتی طور پر ایک ہونے کے باوجود ان کی ذاتی اور اندرونی دنیا کی شمولیت نے ہر ایک کو ہر ایک سے جدا رکھا۔ کسی کا اسلوب کسی سے نہیں ملتا۔ سبھوں نے اپنے اپنے تجزیے، مشاہدے اور علمی مباحث اپنے اپنے لفظیات اور اپنے اپنے انداز میں پیش کیے۔

صرف ہمارے یہاں ہی نہیں بلکہ امریکہ یورپ، اور ایشیا میں بھی اس بات کی ایسی روشن اور ناقابل تردید مثالیں ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک قلمکار کئی جہات کا مالک ہوتا ہے۔ یعنی شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری بھی کرتا ہے، ناول بھی تخلیق کرتا ہے، صحافی بھی ہے، تنقید بھی لکھتا ہے اور ڈرامہ نگاری سے بھی وابستہ ہے۔ زیادہ تر لکھنے والے مذکورہ بالا شعبوں میں سے کم از کم دو سے تو ضرور منسلک ہوتے ہیں۔

ایک چیز اور جو امریکہ اور یورپ میں کم دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک لکھنے والا جس شعبے کی وساطت سے ادب کی دنیا میں داخل ہوتا ہے اس میں وہ نمایاں کارکردگی نہیں دکھا پاتا بلکہ بعد میں جس میدان میں لکھنے کا آغاز کرتا ہے اس میں اپنی انمٹ شناخت قائم کر لیتا ہے۔ مثلاً مجنوں صاحب شاعری کی وساطت سے ادب کی دنیا میں آئے مگر ان کی شناخت نمایاں طور پر تنقید اور افسانہ نویسی سے قائم ہوئی ممتاز حسین صاحب نے افسانہ نگاری سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا مگر ان کی پہچان تنقید سے مستحکم ہوئی۔ سردار جعفری نے شروع میں افسانے بھی لکھے مگر ادب میں ان کا نام بحیثیت شاعر بہت اونچا ہے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین بھی بیک وقت ادب کے کئی اصناف سے منسلک رہے۔ انھوں نے شاعری بھی کی ہے، افسانے بھی لکھے ہیں، خاکہ نگاری سے بھی وابستہ رہے، ڈرامے بھی تخلیق کیے، فیچر بھی لکھے اور نقد نگاری بھی کرتے رہے۔ لیکن جریدہ ادب پر ان کا نام دو اصناف ۔۔۔ خاکہ نویسی اور تنقید نگاری ۔۔۔ کے سبب ثبت دوام کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۴۲ء میں ایک مضمون سے ہوا جو جھانسی کے

ایک اخبار میں شائع ہوا۔ لیکن باقاعدہ ادبی زندگی افسانہ نگاری سے شروع ہوتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کا پہلا افسانہ ''سوچ'' کے نام سے ۱۹۴۳ء میں ماہنامہ ''نگار'' لکھنؤ میں طبع ہوا۔ ان کے افسانے زیادہ تر نگار، ادب لطیف اور ساقی میں شائع ہوئے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ ''انتظارِ سحر'' کے نام سے طبع ہوا۔ انھوں نے جو ڈرامے لکھے ان کا ایک انتخاب ''انکار'' کے نام سے شائع ہوا۔ 'نیم رخ' ان کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، یگانہ چنگیزی، اسرار الحق مجاز، میرا جی، فیض احمد فیض، سلام مچھلی شہری، نہال سیوہاروی اور عزیز حامد مدنی پر خاکے شامل ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب '' آغا شاعر حیات و شاعری'' کے نام سے مرتب کی۔ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے قزلباش کی شخصیت اور فن پر محیط ہے۔ یہ کتاب قزلباش پر لکھے گئے مختلف ادیبوں اور ناقدوں کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''تہذیب وتحریر'' اور ''ادب وآگہی'' کے نام سے شائع ہوئے۔

مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مصلحت سے گریز کرتے ہوئے بیباکی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یعنی صداقت کا دامن کسی حال میں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لیکن ان کی بیباکی سے شائستگی اور تہذیبی قدروں کو ٹھیس نہیں پہنچتا۔ ان کی تحریر کا یہ جوہر ان کے افسانوں میں بھی ملتا ہے اور ڈراموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن خاکوں اور نقد پاروں میں یہ عنصر کچھ زیادہ ہی ہے مگر معتدل اور متوازن انداز میں ہے۔

مجتبیٰ حسین، پروفیسر احتشام حسین سے دس برس اور ممتاز حسین سے چار برس چھوٹے تھے۔ احتشام حسین ۱۹۱۲ء، ممتاز حسین ۱۹۱۸ء اور مجتبیٰ حسین ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ اردو ادب کے یہ تین ناقدین جو ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشترکہ خصوصیت کے بھی حامل تھے۔ ان تینوں حضرات کا تعلق افسانہ نگاری سے رہا اور بعد میں انتقادیات کی طرف آئے اور ایسے آئے کہ پھر سابقہ میدان کی طرف مراجعت نہ کی۔

مجتبیٰ حسین کی ولادت یو پی کے ضلع جونپور میں ہوئی۔ ان کا تعلق اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔ انھوں نے بھرپور زندگی گزاری۔ علمی وادبی لحاظ سے بھی اور عمومی زندگی کے تناظر میں بھی۔ عام طور پر یہ خیال عام ہے کہ ادیب وشاعر کھیل کود اور دیگر تفریحات سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن یہ خیال بس خیال ہی ہے اس میں حقیقت کا شائبہ کم ہی ہے۔ اب مجتبیٰ حسین صاحب ہی کو دیکھ لیجئے۔ وہ کم سنی ہی میں سانپ کا شکار مہارت سے کرتے تھے۔ ہاکی، کبڈی اور کشتی سے شغف رہا۔ کشتی سے تو انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ بقول ان کے ''کشتی لڑنے کا جنون اس حد تک تھا کہ شادی کے روز برات دلہن کے گھر جانے کو تیار تھی اور میں اکھاڑے

میں کشتی لڑ رہا تھا۔ مجھے زبردستی اکھاڑے سے گھر لے جایا گیا۔" (میرا بچپن: مطبوعہ ماہنامہ "ہمدرد نونہال")

انھوں نے ۱۹۳۵ء میں میٹرک کیا۔ انھیں عملی سیاست سے بھی گہری دلچسپی رہی اور "تحریکِ آزادی" میں بھی حصہ لیا اور اس میدان میں اتنے منہمک ہوئے کہ میٹرک کے بعد حصول تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو بی اے کرنے میں کچھ تاخیر ہوگئی۔ مجتبیٰ حسین نے گریجویشن ۱۹۴۳ء میں اور ایم۔ اے (اردو) ۱۹۴۵ء میں کیا۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسان اپنے ارد گرد ہونے والے وقوعات، تصادمات اور سانحات سے متاثر ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ خارجی تغیرات اس میں تبدیلی بھی پیدا کرتے ہیں۔ احتشام حسین اور مجتبیٰ حسین نے بھی اپنے ماحول کے اثرات قبول کرتے ہوئے سیاست اور تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ جب تک یہ دونوں اپنے اپنے گاؤں میں رہے بہت پرسکون اور غیر متحرک زندگی گزارتے رہے۔ لیکن جب وہ الہٰ آباد پہنچے تو ان کے اندر زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ الہ آباد نہ صرف ایک مردم خیز شہر تھا بلکہ مختلف تحریکوں کی آماجگاہ بھی تھا۔ یہ اپنے اندر کئی خصوصیات کا حامل رہا ہے۔ علمی، تہذیبی، ادبی اور سیاسی سرگرمی کے لحاظ سے بھی یہ ایک تاریخ ساز شہر رہا۔ اس شہر کی دیگر خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت تو یہ ہے کہ یہیں سے موتی لال اور جواہر لال نہرو افق سیاست پر نمودار ہوئے، اکبر یہیں پیدا ہوئے، یہیں فراق بھی تھے، مجنوں بھی رہے، سید احتشام حسین نے بھی سیاسی شعوری اور فکری پختگی اسی شہر کی علمی اور سماجی نیز سیاسی فضا میں حاصل کی۔ احتشام حسین خود لکھتے ہیں کہ اس شہر میں آکر ان میں کیسی تبدیلی آئی اور کس طرح انھیں زندگی زندگی معلوم ہونے لگی اور کس طرح ان میں بھی سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ لکھتے ہیں:

> "انٹرمیڈیٹ کے لئے الہ آباد جانا ہوا۔ جولائی ۱۹۳۰ء ہندوستان کی تاریخ میں میرے لئے یادگار ہے۔ الہ آباد میں زندگی زندگی معلوم ہو رہی تھی۔ سول نافرمانی شباب پر تھی۔ اور مجھے اس سے پوری دلچسپی ہوگئی۔ میرے مطالعے کا انداز بدلا تو میرا طریقہ فکر و نظر بھی بدل گیا۔ آٹھ سال کے مسلسل قیام میں وہاں کئی ذہنی دور گزر گئے۔ یہ آٹھ سال دل و دماغ دونوں کے لئے بے پناہ حرکت اور زندگی کے حامل تھے۔"
>
> (خودنوشت مطبوعہ سہ ماہی "ارتقا" شمارہ ۱۲، ستمبر ۱۹۹۲ء کراچی "پروفیسر احتشام حسین نمبر")

یہی حال مجتبیٰ حسین کا بھی ہوا۔ الہٰ آباد جامعہ میں آتے ہی ان کے اندر موجود سیاست کا پُرجوش رسیا پھر سے بیدار ہو گیا اور انھوں نے سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس زمانے میں حکومتِ برطانیہ کے خلاف غم و غصہ کی لہر الہٰ آباد سمیت ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں دوڑ گئی

تھی۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے طالب علموں نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مجتبیٰ حسین بھی طلبا تحریک میں شامل ہوگئے۔ وہیں ان کو بڑے بڑے لیڈروں، شاعروں اور ادیبوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کی تقریریں سننے کا موقعہ ملا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، سبھاش چندر بوس اور حسرت موہانی جیسی شخصیتوں کی خطابت سے فیض حاصل کیا۔ غرض کہ الہٰ آباد کے قیام کے دوران ان کی خارجی اور داخلی دنیا میں بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ ان کے اندر خود اعتمادی اور انحراف کی جرأت پیدا ہوئی۔ اصل اور نقل کی پہچان کا درک حاصل ہوا۔

ان کی عملی زندگی تلخ و شیریں دونوں واقعات سے پُر ہے۔ جب تک ہندوستان میں رہے بڑی فراغت کی زندگی گزاری۔ وہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے ایک سال بعد ہی پاکستان آگئے۔ یہیں انھیں کافی عرصے تک زندگی کے تلخ ذائقے چکھنے پڑے۔ انھوں نے بے روزگاری کے مصائب بھی برداشت کیے، بے گھری کے دکھ بھی سہے۔ بالآخر روزگار سے لگے۔ اسکول میں پڑھایا، چینی سفارت خانے کے خبرنامہ کے مدیر کی حیثیت سے کم و بیش آٹھ برس منسلک رہے۔ نیشنل کالج کراچی اور سراج الدولہ کالج میں بحیثیت صدر شعبہء اردو خدمات انجام دیں۔ ریڈیو پاکستان کراچی میں ملازمت کی، اس کے لئے ڈرامے اور فیچر لکھے اور یہاں کے لئے بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ سید عابد رضوی جو ریڈیو میں ان کے ساتھ رہے۔ اپنے ایک مضمون ''پروفیسر مجتبیٰ حسین'' میں جو ماہنامہ ''افکار'' اگست ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہوا مجتبیٰ حسین کی متعدد بے پناہ صلاحیتوں کا بڑی کشادہ دلی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین ترقی پسند تحریک سے الہ آباد ہی میں وابستہ ہو گئے تھے۔ کراچی آ کر بھی ان کی سرگرمی اسی طرح جاری رہی۔ کراچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں ان کی کوششوں اور انہماک کو بڑا دخل رہا۔

ترقی پسند شاعروں پر جہاں اور بہت سارے الزامات لگائے گئے ہیں وہاں ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ ان کا بس ایک ہی موضوع ہے وہ ہے نعرہء انقلاب اور مزدور و کسان کی حق تلفی کے خلاف لکھنا اور سرمایہ داروں پر نکتہ چینی کرنا۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ یہ ماضی کی روایتوں اور قدروں کو رد کرتے ہیں اور عہد رفتہ کے ادبی سرمائے کو بے کار سمجھتے ہیں۔

لیکن وقت نے اور ترقی پسند قلمکاروں کی تحریروں نے اس قسم کے بہتانوں اور نکتہ چینیوں کو غلط ثابت کر دیا۔ ماضی کی قدروں کے احترام اور اہمیت کے حوالے سے جہاں پروفیسر مجنوں گورکھپوری، سید

سبط حسن، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر ممتاز حسین اور پروفیسر عزیز احمد نے بہت کچھ لکھا وہاں سید مجتبیٰ حسین نے بھی اس حوالے سے متعدد مضامین میں ماضی کی صحت مند اور جاندار روایات واقدار کو نہ صرف احترام کی نگاہوں سے دیکھا بلکہ اس کے خلاف بولنے والوں کو ٹوکا اور روکا بھی ہے۔ یعنی ادب جو ماضی میں تخلیق کیا گیا اس کے دفاع میں بھی اپنا زور قلم صرف کیا۔ صبا اکبر آبادی کی غزل نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ایک غلط رجحان ادب سے تعلق خاطر رکھنے والوں کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے کہ روایت سے وابستہ شاعر جدید عہد کا ادراک نہیں رکھتا۔

درست یہ ہے کہ ہر زمانے کا شاعر جو کچھ اپنے ماضی سے سیکھتا ہے، حاصل کرتا ہے، وہ اپنے عہد کو لوٹا دیتا ہے۔ جدید شاعر روایت کو قدامت سمجھتا ہے۔ جو ماضی سے نہیں سیکھتا وہ مفلس ہے۔ وہ اپنے زمانے اور مستقبل کو کیا دے سکے گا۔ شاعری اور فن کے مطالبات ہمیں ماضی سکھاتا ہے۔ اور وہ زمانہ جس میں ہم سانس لیتے ہیں زندگی کے تجربات سے آگاہ کرتا ہے۔ مطالبات و تجربات کے بطن سے فکری رعنائی بھی پیدا ہوتی ہے اور جذباتی بصیرت بھی۔ یہی وہ تحفہ ہے جو مستقبل کو پیش کیا جاسکتا ہے۔''

نقاد ادب کا کام صرف انفرادی طور پر تخلیق کاروں کے فن پاروں پر اظہار خیال کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ وہ پوری دنیا کے علوم وفنون کے مطالعاتی سفر کے تجربات ومشاہدات کو جن میں ماضی اور حال دونوں علوم شامل ہیں اپنے اندر جذب بھی کرے۔ وہ اپنے انھیں علوم وتجربات کے روشنی کو نہ صرف اپنے عہد کے لکھنے والوں تک پہنچائے بلکہ جس زبان وادب سے وہ وابستہ ہے اس زبان وادب کے تخلیق کاروں کے فن پاروں کا احتساب بھی انھیں کی روشنی میں کرے۔ تنقید ہو یا تخلیق اس کے امر ہونے میں اعتدال اور توازن کا کلیدی کردار رہا ہے۔ مثلاً موضوع اہم ہے مگر اسلوب اسے پرکشش بنانے میں ناکام ہے تو وہ اسے کامیاب فن پارہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح اگر اسلوب میں جدت ہے مگر فکر اور موضوع فرسودہ اور غیر اہم ہے تو وہ تخلیق بھی ایک ناکام کوشش کے زمرے میں آئے گی۔

مجتبیٰ حسین اس نکتے کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اور اپنی تنقیدی فتوحات کے ذریعہ اس نکتے کو احسن طریقے سے اجاگر بھی کیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں کشادہ ذہن، کشادہ دل اور آزاد فکری رویوں کے حامل نقاد تھے۔ ان کے یہاں اختلاف رائے اور شائستہ بحث وتمحیص کو خصوصی اہمیت حاصل

ہے۔ لیکن اختلاف رائے اور کسی شئے کی ناپسندیدگی کے باب میں وہ یکطرفہ رویے، انتہا پسندی اور انار کی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ تبدیلی اور تغیر کے قائل تھے، عصری تقاضوں کو اہمیت دیتے تھے، کٹر پن اور ہٹ دھرمی کو منفی رویہ تصور کرتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تہذیبی اور سماجی نیز سیاسی و معاشی سماج میں تبدیلی کیسے آتی ہے کہاں اچانک پن رونما ہوسکتی ہے اور کہاں سست روی اور غیر محسوس تبدیلی اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ پھر یہ کہ ادب کی دنیا میں جو نیا پن پیدا ہوتا ہے اور انسانی معاشرے میں جو تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ کیا دونوں ایک ہی طرح اپنا سفر طے کرتے ہیں یا مختلف انداز میں رونما ہوتے ہیں۔ یہ موضوع بلاشبہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور ہر پچیس تیس سال پر یہ سوال ہر دور میں اٹھتا رہا ہے اور اٹھتا رہے گا۔ مجتبیٰ حسین اس مسئلے پر اپنی عالمانہ رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ادب میں نئی اور پرانی نسل کا تصور بعینہ ویسا نہیں رہا ہے جیسے معاشرے میں ہوتا آیا ہے کہ ایک مخصوص معاشرے کی پرانی نسل آپ کو انگرکھے میں نظر آرہی ہے اور دوسری نسل کوٹ پتلون میں۔ اولاً تو معاشرے کی اتنی قطعی، حتمی اور واضح تقسیم بذاتہ مصنوعی اور انتہائی ناقص ہے، دوسرے خود معاشرے میں معاشی اور سیاسی نظام کی تبدیلیوں کے سوا کوئی اور تبدیلی اچانک طور پر ممکن نہیں۔ معاشی اور سیاسی نظام میں تو البتہ دفعتاً ایک انقلاب لایا جاسکتا ہے مگر تہذیبی اور تمدنی اقدار کو یک لخت اور فوراً بدلنا ممکن نہیں۔ ان اقدار کی تبدیلی کی رفتار بہت سست اور بسا اوقات غیر محسوس طور پر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض پرانی اقدار کو ہر آنے والا معاشرہ اپنے مزاج اور تصورات کے مطابق اپناتا رہتا ہے۔ اسی بنا پر ہم مختلف ممالک کی تہذیبوں کے مخصوص رنگ سے متعارف اور آگاہ ہوتے ہیں اور ان میں امتیاز کرتے ہیں۔"

سب سے پہلی بات۔۔ اگر فرض کرلیں۔۔ کسی معاشرے اور تہذیب میں یک لخت تغیر سے کام لیا گیا تو ہر بیس پچیس سال کے بعد ملکوں، خطوں یا قوموں کی شناخت ختم ہوجائے گی، ان کی ثقافتی اور تمدنی پہچان مٹ جائے گی۔ ایسی صورت میں اس قوم کو کن اقدار سے شناخت کرنا ممکن ہوسکے گا؟ کیوں کہ ابھی ایک پہچان سے لوگ آشنا ہو ہی رہے ہوں گے کہ اچانک وہ پہچان غائب اور اس کی جگہ کوئی نئی چیز رونما ہوتی نظر آئے گی۔ بہ ایں صورت کسی قوم کی نہ کوئی قدر قائم ہوسکے گی نہ کوئی مستحکم روایت معرض وجود میں آسکے گی۔ یہ رویہ نہ تاریخی عمل کا ساتھ دے سکے گا نہ تمدنی و ثقافتی اقدار کو جلا بخشے گا بلکہ اسے غیر فطری اور ناقابل فہم اقدام سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس طرح نہ ہم مختلف ممالک کی تہذیبوں کے مخصوص رنگ سے

متعارف ہو پائیں گے اور نہ ان میں امتیاز کر پائیں گے۔ ہر قوم کی تہذیب، ثقافت اور ادب میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ لیکن اس کی رفتار طوفان صفت نہیں ہوتی۔ کچھ بنیادی قدریں اور روایتیں ایسی ہوتی ہیں جو قائم رہتی ہیں ان میں بھی تبدیلی آتی ہے مگر کافی طویل عرصے میں وہ بھی غیر محسوس انداز میں۔

دوسری بات: ایسا کرنا ممکنات میں نہیں ہے۔ ہر خطے، ہر ملک اور ہر قوم کی کچھ علاقائی، زمینی، جغرافیائی اور دیگر بہت ساری خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو انھیں سے معنون ہیں۔ افریقہ جیسے بر اعظم میں جہاں اتنی گرمی ہوتی ہے کہ وہاں کے لوگ سیاہ فام اور بھدے خدوخال کے ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان کا رہن سہن اس خطے کے جغرافیائی جبر کے مطابق ہے۔ حتیٰ کہ بود و باش کے ساتھ ساتھ خورد و نوش کی اشیا بھی دوسرے خطوں سے مختلف ہیں۔ زبان جو ذریعۂ اظہار ہے وہ بھی علاقائی خصوصیات کے سبب از خود مختلف انداز میں وجود پذیر ہوتی ہے۔ زبانوں کو کسی نے کسی منصوبہ اور فارمولے کے تحت نہیں بنایا ہے بلکہ یہ زمینی حقائق، موسم اور ارد گرد کی اشیاء کے روابط سے ایک مخصوص عمل کے ذریعہ معرض وجود میں آتی ہیں۔ ایک دن کے بچے کو چشم زدن میں ساٹھ سال کا انسان تو نہیں بنایا جاسکتا۔ بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی اور ادھیڑ عمری کے مرحلے سے گزر کر ہی وہ ساٹھ سالہ فرد کا روپ اختیار کر سکتا ہے۔ ایسی بے معنی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سیاست میں انقلاب اور ادب میں انقلاب ہر چند تغیر اور تبدیلی کا اعلامیہ ہے۔ مگر رفتار، اطوار اور شعار میں یہ ایک دوسرے کے مماثل نہیں۔

ادب میں بامعنی تبدیلی، خوش آئند تغیر اور نئے تقاضوں کو اپنانے کے حوالے سے جو فرائض تنقید نگار ادا کر سکتا ہے وہ تخلیق کار سے ممکن نہیں۔ اس اہم فرض کو سمجھتے ہوئے جہاں دوسرے ناقدین نے اپنا کردار ادا کیا ہے وہاں مجتبیٰ حسین نے بھی اپنے فرائض نبھانے کی شاندار کوشش کی ہے۔ جہاں وہ نئی نسل کی جدت پسندی، عصری تبدیلی کی طرف رغبت اور آگے بڑھنے کی للک اور لہک کو سراہتے ہیں وہاں ان کی شدت پسندی، ماضی کی قدروں سے بیزاری، بے سمجھے بوجھے تمام روایات کے خلاف اظہار تنفر اور زبان و بیان کی بے راہروی کو بھی نشان زد کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ تنقیص نہیں بلکہ تنقیح سے کام لیتے ہیں۔ ان کے لہجے میں نرمی اور شائستگی ہے، اسلوب میں سیدھا پن ہے، ژولیدگی نہیں۔ تنقید کی زبان کا جو ایک عالمانہ رویہ ہوتا ہے وہ رویہ ان کی تحریروں میں بدرجۂ اُتم موجود ہے۔

نئی نسل کا جو عام رویہ ہوتا ہے اس کے بارے میں اور اس باب میں ان کے اندر جو فطری للک اور امنگ جنم لیتی ہے اس کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

''نئی نسل نئے مسائل کی بیک وقت پروردہ بھی ہوتی ہے اور انھیں پیدا بھی کرتی ہے۔اس کا تعلق اپنے دور کے مسائل سے پرانی نسل کے مقابلے میں زیادہ قریبی اور گہرا ہوتا ہے یا ہونا چاہئے۔تاریخ جب ایک دور ختم کر کے نئے موڑ پر پہنچ جاتی ہے اور حالات بدلنے لگتے ہیں اور نئے حالات رونما ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو نئی اور پرانی نسل میں حد فاصل کھینچنا ممکن ہو جاتا ہے۔ہر چند اس حد فاصل کو سن و سال کے لحاظ سے متعین کرنے میں الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں،اور بعض اوقات ہم غلط نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔لیکن اس امر میں بھی صداقت ہے کہ نئے زمانے کو قبول کرنے میں طبعی عمر کا بھی فیض شامل ہوتا ہے۔

نئی نسل پرانی نسل کی بہ نسبت زیادہ آسانی اور کھلے دل سے نئے تغیرات کو قبول کر سکتی ہے۔اس میں نئے حالات کو پرکھنے،سمجھنے اور اپنانے کے سلسلے میں جو لہک اور تازگی پائی جاتی ہے وہ پرانی نسل میں نسبتاً کم ہوتی ہے۔لیکن طبعی عمر کا یہ عمل دخل صرف ایک حد تک اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔''

اردو میں تقابلی تنقید کی روایت اگر بہت تابناک نہیں تو بہت مدھم بھی نہیں ہے۔اس باب میں احتشام حسین نے بہت زیادہ انہماک کا مظاہرہ کیا ہے۔مجتبیٰ حسین کی نقد نگاری میں بھی یہ پہلو نمایاں ہے۔تقابلی مطالعہ عموماً دوسری زبان کے ادب اور ادب تخلیق کرنے والوں سے کیا جاتا ہے۔جس کا تعلق بین الاقوامیت سے ہے۔مجتبیٰ حسین کے یہاں بین الاقوامیت کے ساتھ ساتھ مقامی تقابلی مطالعہ کا رویہ بھی ملتا ہے۔یعنی اردو ادب ہی کے لکھنے والوں کی تخلیقی مماثلت کو نشان زد کیا ہے اور اصناف کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے تخلیقی رویوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔وہ ادا جعفری کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خواتین کے زمرے میں جدید شاعری کو ایک نیا زاویہ دینے میں انھوں نے وہی کام کیا ہے جو ایک دوسری نوعیت اور حیثیت سے عصمت چغتائی نے افسانوں میں کیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ عصمت چغتائی افسانہ نگاری کا بڑا نام ہے جو خواتین کے دائرے کو توڑ کر نکل گیا ہے۔مرد افسانہ نگاروں میں بھی ان کے مخصوص اندازِ نگارش کا کوئی جواب نہیں ہے۔حقائق کو بے نقاب کرتا ہوا اسلوب جو انھیں ملا ہے وہ اردو افسانہ نگاری کا سرمایہ ہے۔لیکن تاریخی حیثیت سے ادا جعفری نے شاعری کے جدید تجربات کی طرف خواتین کو متوجہ کر

نے میں جو کام کیا ہے اس کی اہمیت کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔''

مندرجہ بالا عبارت سے جہاں ادا جعفری اور عصمت چغتائی کے تقابلی مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اس عبارت میں ایک اور تقابلی مطالعے کی بھی ایک ہلکی سی جھلک ملتی ہے۔ یعنی ''مرد افسانہ نگاروں میں بھی ان کے (عصمت چغتائی) مخصوص اندازِ نگارش کا کوئی جواب نہیں ہے۔''

اس سے یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ ان ناقدین میں نہیں جو صرف شاعری کی تنقید لکھتے ہیں اور افسانے کے مطالعے سے دامن بچاتے ہیں اور نہ ان کا شمار ان میں ہوتا ہے جو صرف افسانے کی تنقید لکھنے پر فخر کرتے ہیں اور شاعری کی تنقید سے گریز کرتے ہیں۔ ایک مکمل اور جنوین نقاد کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ جس زبان کا ناقد ہے اسے اپنی زبان کی تمام اصناف کے عروج وزوال سے باخبر رہنا چاہئے۔ کون کیا لکھ رہا ہے کیسا لکھ رہا ہے اور کتنا لکھ رہا ہے اس سے اس کی واقفیت ضروری ہے۔ صرف یہی نہیں تقابلی مطالعے کے لئے اسے چاہئے کہ وہ اپنی زبان کی اصناف کے مطالعے کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی مماثل اصناف کی ارتقائی رفتار کو بھی نظر میں رکھے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین اردو کے ایسے ہی نقادوں میں تھے جو اپنی زبان کی تمام اصناف کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کی مماثل ادبی اصناف سے بھی باخبر تھے۔

ان کے بہت سے مضامین مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں جو ان کی دو تنقیدی مضامین کی کتابوں ''تہذیب وتحریر'' اور ''ادب وآگہی'' میں شامل نہیں۔ میرے خیال سے انھوں نے ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد بھی بہت کچھ لکھا تھا مگر افسوس کہ وہ سب ایک جگہ کہیں محفوظ نہیں۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان کی بکھرے ہوئی انتقادیاتی تحریروں کو جمع کرکے ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

اوپر کے اقتباس میں انھوں نے عصمت کی طرز نگارش کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ ''حقائق کو بے نقاب کرتا ہوا اسلوب جو انھیں ملا ہے وہ اردو افسانہ نگاری کا سرمایہ ہے۔'' یہ بات خود ان پر بھی منطبق ہوتی ہے کہ حقیقت اور صداقت کی نشاندہی کرتا ہوا ان کو تنقید نگاری کا جو اسلوب اور جوہر ملا ہے وہ اردو تنقید نگاری کا گراں قدر سرمایہ ہے اور ہمیں اس سرمائے کو ضائع ہونے سے بچانا ہے۔

مسلم شمیم

پروفیسر مجتبیٰ حسین

پروفیسر مجتبیٰ حسین کو ادب کے اُفق سے اوجھل ہوئے ایک سال کا عرصہ بیت گیا، مگر وہ ایک ایسے روشن ستارے کی مانند تھے جو اپنی تحریروں اور فکر کے حوالے سے آسمانِ ادب پر عرصہ دراز تک پوری تابندی کے ساتھ چمکتے رہیں گے۔ ان کی ادبی حیثیت مختلف زاویوں سے یکساں وقیع اور محترم تھی۔ ان کی تنقید نگاری میں پائی جانے والی تہذیبی پاسداری کے ساتھ ندرت، وسیع النظری انہیں دیگر اربابِ نقد و نظر سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ ان کی تنقید نگاری ہر چند کہ ترقی پسندیت کی روایت کے زمرے میں آتی ہے، مگر وہ کسی کے مقلد نہیں کہے جاسکتے۔ ان کا زاویہ نگاہ سکہ بند ترقی پسند ناقدین سے مختلف تھا۔ انہوں نے فن کو نظریات پر قربان کردینے کی کبھی تائید نہیں کی۔ ان کے یہاں جمالیات کے اپنے معیارات تھے جو زندگی کے حقائق سے عبارت تھے۔ ان کی تنقید میں زندگی کی مثبت قدروں کی بڑی خوبصورت ترجمانی ملتی ہے۔ تجزیہ و تاثرات کے ساتھ اور کئی لہریں ان کے یہاں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ ان سب سے مل کر ان کی انفرادیت ابھرتی محسوس ہوتی ہے ان کی تنقید کی زبان کہیں بوجھل اور ثقیل نہیں ہوتی، بلکہ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی قارئین کے دل و دماغ پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے۔ ان کے اسلوب کی سادگی اور شگفتگی یہ واضح کرتی ہے کہ انہوں نے جن مسائل اور موضوعات پر قلم اٹھایا وہ ان کا ادراک ہی نہیں بلکہ معروضی حالات کے تناظر میں ان کا بھرپور شعور رکھتے تھے۔ وہ کہیں ابہام اور ایہام میں مبتلا نظر نہیں آتے بلکہ اظہار اور ابلاغ ان کے یہاں دو متوازی چلنے والی رو محسوس ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ اردو تنقید کی تاریخ میں وہ ایک مستند نام کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔

مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے متعدد پہلو تھے اور ہر پہلو یکساں طور پر روشن و تابناک تھا۔ ان کی خوش گفتاری اور بذلہ سنجی کے تذکرے ان کے حلقۂ احباب میں آج بھی پسندیدہ موضوعِ سخن ٹھہرتے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں بحیثیت استاد ان کی قدر و منزلت، احترامِ استاد کی دیرینہ روایت کی تازہ مثال کہی

جاسکتی ہے۔ انہوں نے سیکڑوں ذہنوں کو جلا بخشی، علم وشعور کے نئے امکانات سے انہیں روشناس کرایا۔ وہ علم ودانش کا ایک سرچشمہ تھے جس سے ہزاروں مشتاقانِ علم ودانش نے فیض حاصل کیا اور اپنی تشنگی بجھائی۔

وہ دانشوروں اور ادیبوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کا کمٹمنٹ سماجی زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے ہمیشہ پیوستہ رہتا ہے۔ انسان دوستی ان کی رگ وپے میں سرائیت کیے ہوئے تھی۔ وہ صلح جو اور خلوص ومحبت کا پیکر تھے اور انہوں نے اپنی محبتوں کو بانٹنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام ایک ایسی کانفرنس میں شرکت میں گزرے جو ہم عصر معاشرے کا مرکزی موضوع بنا ہوا ہے یعنی جمہوری عمل کا فروغ۔ لاہور میں جمہوریت پسند مصنفین کی سہ روزہ کانفرنس معاشرے میں غیر جمہوری نظریات اور ان کے عملی مظاہرے کے خلاف اور جمہوری عمل کی تائید میں ادیبوں کی حمایت کے اظہار کے لیے منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ان کی پرجوش شرکت سماج سے ان کی کمٹمنٹ پر دلالت کرتی ہے۔ ان کی عالمانہ اور وابستگی سے بھرپور تقریر کے الفاظ آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں معاشرے میں ادیبوں کے افعال کردار کا ایک ایسا مظاہرہ...... وہ اس قدر خوش اور مطمئن تھے کہ طمانیت سے ان کا چہرہ دمکتا ہوا نظر آتا تھا۔ مرحوم اتنے ہشاش بشاش اپنی زندگی میں کم ہی نظر آئے ہوں گے جتنے وہ اس کانفرنس میں نظر آئے تھے۔ غرض یہ کہ ان کی زندگی کا اختتام کانفرنس کے بعد واپسی پر ایک حادثے کے نتیجے میں ہوا جو ایک عظیم المیہ تھا۔ آخری ایام میں ان کی قربت کے نقوش ہمارے ذہن کے گوشوں میں اسی طرح تروتازہ ہیں:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ان کی پہلی برسی کے موقع پر 'طلوعِ افکار' نے ان کا گوشہ شائع کرکے ان کی یاد کو ایک حقیر سا نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کاش یہ گوشہ ہم ان کی زندگی میں شائع کر پاتے اور اس طرح اپنی زندہ دوستی کا ثبوت پیش کر سکتے۔

(مارچ ۱۹۹۰ء)

اقبال فریدی

پروفیسر مجتبیٰ حسین اور جوشؔ ملیح آبادی کی چھڑی

یہ تذکرہ ہے ۱۹۶۷ء یا ۱۹۶۸ء کی شاموں کا، راجہ صاحب محمود آباد نے نظریاتی بنیادوں پر ایک کالج کی بنیاد رکھی۔ سراج الدولہ کالج۔ دُور دُور سے تدریس و تعلیم کے دیوانے راجہ صاحب کے ذرا سے اشارے پر بڑے بڑے مشاہروں کو رَد کرتے ہوئے سراج الدولہ کالج میں بہت معمولی مشاہروں پر درس و تدریس کے لیے جمع ہو گئے۔ کیسے کیسے ستاروں جیسے لوگ تھے۔ مَیں سراج الدولہ کالج کا پہلا طالب علم تھا۔ یہ بات آج بھی ریکارڈ پر دیکھی جا سکتی ہے، پروفیسر مجتبیٰ حسین فرسٹ ائیر، سیکنڈ ائیر اور بی اے کی دونوں کلاسوں کو اردو پڑھانے پر مامور تھے۔ بی۔ اے کی کلاسوں میں انٹر میڈیٹ کے طلبا بھی جو ادب کا ذوق رکھتے تھے جمع ہو جاتے تھے اور اکثر اس کے برعکس بھی ہوتا یہاں دو شفٹوں میں تدریس ہوتی تھی صبح ۸؍ سے ۲ بجے تک اور شام ۸۔ بجے سے ۱۲؍ بجے تک۔ کبھی کبھی اساتذہ اور طلبا کا انہماک بڑھ جاتا تو رات کے ایک ڈیڑھ بھی بج جاتے تھے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین ہمیشہ کاٹن کی شیروانی اور بڑے پائنچے کے سفید ملگجے پاجامے اور پمپ جوتا پہنے نظر آتے۔ ایک دن ہم لوگ اسٹاف روم کے سامنے بنے ہوئے لان میں بیٹھے تھے کہ مجتبیٰ صاحب باہر آئے۔ قمر جمیل صاحب کی نسبت سے وہ مجھے اپنا طالب علم ہی نہیں اپنا چھوٹا بھی سمجھتے تھے۔ باہر آ کر انہوں نے اُنگلی کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ اُن دنوں کریم آباد پر جہاں پرائیویٹ بنگلوز میں سراج الدولہ کالج قائم ہوا تھا وہاں پُل اور دیگر تعمیرات نہیں تھیں اس لیے کالج کے لان سے دس نمبر لیاقت آباد کا چوراہا صاف نظر آتا تھا۔ انہوں نے ایک روپے کا نوٹ مجھے دیا اور دس نمبر کے چوراہے پر بنے ہوئے ایک سگریٹ کے کھوکھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں سے ان کے لیے برسٹل سگریٹ کا ایک پیکٹ لے آؤں۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ایک بہت معروف برانڈ کا سگریٹ جو قیمتی سمجھا جاتا تھا وہ صرف دس آنے کا آتا تھا۔ اس وقت سگریٹ کا یہ برانڈ ۱۲؍ آنے کا تھا۔ مَیں سعادت مند شاگردوں کی طرح دوڑتا ہوا بلکہ اُڑتا ہوا وہاں گیا سگریٹ کا پیکٹ خریدا اور اسی طرح

اڑتا ہوا واپس آیا۔ مجتبیٰ صاحب لان میں ٹہل رہے تھے اور تمام طلبہ مؤدب بیٹھے اور کھڑے ہوئے تھے۔ مَیں نے انتہائی ادب سے برسٹل کا سگریٹ کا پیکٹ نکالا اس پر چمکتی ہوئی روپہلی چونی رکھی جو دوکاندار نے واپس کی تھی۔ دل میں یہ لالچ تھی کہ سر (مجتبیٰ صاحب) یہ چونی مجھے ٹپ کر دیں گے (چونی کی قیمت اس زمانے کے طلبہ بتا سکتے ہیں) مجتبیٰ صاحب نے چونی اٹھائی شیروانی کے اوپر والی جیب میں ڈالی۔ سگریٹ کا پیکٹ شیروانی کی سائڈ پاکٹ میں رکھا اور پھر بڑی شفقت سے میرے کان مروڑتے ہوئے تنبیہ کی کہ ''بڑوں کو پیسے واپس کرتے ہیں بھلا؟ آپ کیسے طالب علم ہیں۔''

چمکتی ہوئی چونی کا اس طرح ہاتھ سے نکل جانا جتنا بڑا دکھ تھا۔ مجتبیٰ صاحب کی تنبیہ نے اس دکھ کو اور بڑھا دیا۔ پرائیویٹ بنگلوں میں قائم اس سراج الدولہ کالج میں چھوٹے بڑے لان کے کئی قطعات تھے۔ شام کی کلاسوں کے دوران اور کلاسوں کے بعد ان سبزہ زاروں کی شبنم سے بھیگی ہوئی فضا اور سفید ٹیوب لائٹ کی روشنی ایک عجیب سحر کا ماحول پیدا کر دیتی تھی۔ اسی کالج میں ہماری ملاقات بلکہ مجھے جن بڑے بڑے مشاہیر سے ملنے کا اتفاق ہوا ان میں جوشؔ صاحب، مرزا ظفر الحسن، فیض صاحب، سراج الدین ظفرؔ، راغب مراد آبادی، رحمان کیانی، حمایت علی شاعرؔ، صہبا اختر اور دیگر بڑے بڑے اکابرین تھے۔ اکنامکس کے ایک پروفیسر تھے پروفیسر یحیٰی سلام اللہ خان، مجتبیٰ صاحب کے بہت اچھے دوست، یہ بھی ایک ساحرانہ علمی شخصیت تھے۔ مجتبیٰ صاحب اور پروفیسر یحیٰی سلام اللہ خان اکثر کسی نہ کسی موضوع پر بحث میں مصروف رہتے تھے۔ جوش ملیح آبادی کا گھر سراج الدولہ کالج کے عقب میں ذرا فاصلے پر پیدل کے راستے پر تھا۔ مجتبیٰ صاحب ہر دوسرے تیسرے روز شام کی کلاسوں کے بعد شعری نشستوں کا اہتمام کرتے۔ جوشؔ صاحب صدرِ محفل ہوتے اور مجتبیٰ صاحب ان کی محبت میں پروانے کی طرح ان کے گرد گھومتے رہتے، انھیں نشستوں میں ہماری ملاقات راجہ صاحب محمود آباد سے ہوئی جو سراج الدولہ کالج کے بانی تھے۔ انتہائی شفیق، مرنجان مرنج اور وضع دار انسان تھے۔ ان کے رویوں اور بول چال میں مرحوم گمشدہ تہذیب کا رنگ بہت گہرا تھا۔ ایسی ہی ایک نشست میں ایک شام جوش صاحب مدعو تھے۔ نشست کے بعد مجتبیٰ صاحب نے جوشؔ صاحب کی واپسی کے لئے موٹر کا انتظام کروایا اور انہیں سہارا دے کر موٹر میں بٹھایا، موٹر چل پڑی اور جوش صاحب روانہ ہوگئے۔ جوش صاحب کی چھڑی مجتبیٰ صاحب کے ہاتھ میں رہ گئی۔ قدیم سراج الدولہ کالج سے جوش صاحب کے گھر کا راستہ سڑک کے ذریعے ذرا طویل تھا۔ جبکہ کالج

کے عقب کی گلیوں کے راستے پیدل جانے والوں کے لئے یہ راستہ نسبتاً قریب تھا۔ میں بھی جوش صاحب اور مجتبیٰ صاحب کے آس پاس طالب علمانہ انداز میں ادھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ مجتبیٰ صاحب نے پھر مجھے بلایا اور جوش صاحب کی چھڑی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ دوڑ کر جایئے گلیوں کے راستے سے جوش صاحب کے گھر تک اور اس سے پہلے کہ وہ سڑک کے ذریعے وہاں آ کر گاڑی سے اتریں آپ چھڑی ان کے حوالے کرنے کے لئے وہاں موجود رہیں۔ میں نے پھر اس طالب علمانہ سرشاری اور سپردگی سے وہ چھڑی لی اور عقب کے دروازے سے نکل کر جوش صاحب کے گھر تک دوڑ لگادی۔ جب میں ان کے دروازے پر پہنچا تو جوش صاحب کی گاڑی ابھی ان کے گھر سے ذرا فاصلے پر تھی۔ گھر کے گیٹ پر آ کر جونہی وہ گاڑی سے نکلے میں نے ان کی چھڑی انہیں پکڑادی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب کو احساس بھی نہیں ہوا کہ چھڑی اتنی دیر سے ان کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ جوش صاحب کے ساتھ اترنے والے ایک اور بزرگ نے جو شاید عیش ٹونکی تھے' میرا کندھا محبت سے دبایا اور شاباش کہتے ہوئے مجھے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ میں اپنی اس کارکردگی پر بہت خوش اور مطمئن واپس دوڑ پڑا اور واپس جا کر مجتبیٰ صاحب کو رپورٹ دی کہ ''سر میں جوش صاحب کی گاڑی پہنچنے سے پہلے ہی ان کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ وہ جونہی گاڑی سے اترے میں نے چھڑی ان کے سپرد کردی۔ انہیں شاید پتہ بھی نہیں چلا کہ چھڑی اتنی دیر تک ان کے ہاتھ میں نہیں۔''

مجتبیٰ صاحب نے مخصوص انداز میں اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے آنکھوں سے شریر غصے کا اظہار کیا اور ڈانٹ کر پوچھا۔

''چھڑی جوش صاحب کو دی یا کسی اور کے حوالے کردی۔''

''سر وہ میں نے جوش صاحب کو خود اپنے ہاتھوں سے دی ہے۔''

مجتبیٰ صاحب نے افسوس سے اپنی ہتھیلی اپنی پیشانی پر رکھی اور بولے۔

''افسوس آپ بہت بے وقوف طالب علم ہیں آپ کو وہ چھڑی لے کر بھاگ جانا چاہیئے تھا جوش صاحب کے لئے دوسری چھڑی دستیاب ہو جاتی لیکن آپ کو مستقبلِ بعید تک کے لئے ایک قیمتی یادگار مل جاتی اور میں اس کا گواہ ہوتا۔ آپ نے ایک بڑی دولت گنوادی۔''

اس وقت ہی نہیں مجھے آج تک اس بات کا افسوس ہے کہ میں وہ چھڑی لے کر واقعی گھر کیوں نہیں

بھاگ گیا۔ اور پھر مجتبیٰ صاحب کی اس محبت بھری تنقید نے آج تک اس افسوس کو پرانا نہیں ہونے دیا ہے۔

انہیں نشستوں میں ابن انشاء بھی آئے، جمیل الدین عالی بھی آئے اور ابراہیم جلیس بھی اور یہ سب لوگ مجتبیٰ صاحب کی محبت میں جمع ہو جاتے اور وہ جوش صاحب کو میر مجلس بنا کر ان پروانوں کو ہر دوسری تیسری شام سراج الدولہ کالج میں جمع کر لیتے۔ ایک مرتبہ جب پروفیسر مجتبیٰ حسین سراج الدولہ کالج ہی میں استاد تھے اور لیاقت آباد نیرنگ سینما کے عقب میں ان کا گھر تھا۔ ہم چند طالب علموں کو معلوم ہوا کہ آج بخار کے سبب مجتبیٰ صاحب کالج نہیں آئے ہیں تو ہم سب جس میں محمود کنور پیش پیش تھے سراج الدولہ کالج یعنی کریم آباد سے پیدل چلتے ہوئے مجتبیٰ صاحب کے گھر تک آئے وہ لیاقت آباد کے ایک عام سے گھر کے ایک عام سے سجے ہوئے کمرے میں لیٹے تھے۔ چند اخبار اور رسالے سرہانے کی میز پر رکھے تھے۔ دیوار کی کھونٹی پر شیروانی ٹنگی تھی اور وہ ایک موٹی چادر اوڑھے ہوئے لیٹے تھے۔ انہوں نے نقاہت زدہ مسکراہٹ کے ساتھ سب کو اطراف میں رکھی ہوئی لکڑی کی کرسیوں اور چارپائی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ محمود کنور نے جو اس وقت موجود طلبہ میں سب سے زیادہ عمر کے تھے اور مجتبیٰ صاحب سے نسبتاً زیادہ قریب تھے انہوں نے مجتبیٰ صاحب کے پاؤں کے تلوے کو عقیدت اور محبت کے ساتھ چھوئے اور محبت سے پوچھا۔

''سر آپ کو بخار ہو گیا ہے۔''

انہوں نے جواباً کہا۔

''محمود کنور ملیریا ہوتا ہے۔ نمونیہ ہوتا ہے۔ ٹی بی ہوتی ہے مگر بخار ہوتا نہیں بخار آتا ہے۔ مجھے بخار آ گیا ہے۔''

تدریس و تعلیم کا یہ لمحہ آج تک میرے لیے کسی سرمائے سے کم نہیں۔

مجتبیٰ حسین صاحب جیسے شعر فہم استاد اب نہیں ملتے۔ وہ اڑتے ہوئے اشعار کے رموزیوں بیان کر دیتے گویا وہ شاعر کی ہر کیفیت سے واقف تھے۔ خود شعر سنانے میں بہت چور تھے۔ خود کو شاعر کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب کراچی کی سڑکوں پر احتجاجی طلبہ کی لاشیں گریں تو مجتبیٰ صاحب نے ایک نظم کہی تھی۔ یہ مجتبیٰ حسین صاحب کی تازہ نظم تھی۔ اپنے عزیز طلبا کے اصرار پر ایک بار انہوں نے یہ نظم ایک نشست میں پڑھی تھی اور ان کے چشمے کے پیچھے سے مسکراتی آنکھیں اس وقت حزن و ملال کے غلاف

میں لپٹی ہوئی تھیں جب وہ یہ نظم پڑھ رہے تھے

کتاب لے کے آئے تھے
کتاب لے کے سو گئے
سوال لے کے آئے تھے
جواب لے کے سو گئے

مجتبیٰ صاحب کی آنکھوں کا ملال پوری مجلس کو ملول کر گیا۔ طلبہ اور اساتذہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کسی مصرعے پر واہ بھی کر سکتے۔ گہرے سکوت میں نظم ختم ہوئی۔ اس کے بعد حافظے میں ایک سناٹا ہے اور یہ یاد نہیں کہ مجلس کس طرح ختم ہوئی۔

پھر خاصے عرصے بعد یعنی ۱۹۷۴ء میں' میرا تقرر بحیثیت ریگولر پروڈیوسر ہو گیا۔ پھر ایک مرتبہ جب میری پوسٹنگ حیدر آباد (سندھ) اسٹیشن پر تھی تو ایک صبح میری مسرت اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب دفتر کے کمرے میں مجھے پروفیسر مجتبیٰ حسین کا فون موصول ہوا کہ میں حیدر آباد (سندھ) آیا ہوا ہوں اور یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ انہوں نے حیدر آباد میں اسٹیٹ بینک کے ایک بڑے افسر کا نام اور پتہ بتایا۔ اس وقت حیدر آباد اسٹیشن پر جناب لیاقت بلوچ اسٹیشن ڈائریکٹر تھے' وہ مجتبیٰ حسین صاحب کی علمی حیثیت سے واقف تھے۔ میری درخواست پر انہوں نے انٹرویو ریکارڈ کرنے کی اجازت دے دی۔ میں ایک کیسیٹ ریکارڈ لے کر ان کا خصوصی انٹرویو برائے حیدر آباد اسٹیشن ریکارڈ کیا جس میں انہوں نے فراق گورکھپوری' مجنوں گورکھپوری اور پروفیسر احتشام حسین کے بارے میں بہت وقیع باتیں کیں جو حیدر آباد اسٹیشن کے ادبی پروگرام میں نشر بھی ہوئیں حالانکہ یہ انٹرویو حیدر آباد اسٹیشن کی ساؤنڈ لائبریری میں محفوظ کرا دیا گیا تھا لیکن دستبرد زمانہ کے سبب یہ کیسیٹ محفوظ نہ رہ سکا اور اب صرف پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب کی یادیں ہیں اور ہم "بے استادے" رہ گئے۔ اس لیے کہ پھر کوئٹہ اور کوئٹہ سے لاہور اور لاہور ائیر پورٹ کے راستے میں روڈ ایکسیڈنٹ اور پھر کہانی ختم حالانکہ مجھ جیسے بہت سے کندۂ ناتراش کے بہت سے غیر مہذب گوشے چھپنے سے رہ گئے اور وہ خود:

کتاب لے کے آئے تھے
کتاب لے کے سو گئے

اس وقت پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب نارتھ ناظم آباد میں اپنے اور بچوں کے لیے ایک نیا مکان بنا چکے تھے جو ان کے بعد ان کے بچوں میں بڑے اختلافات کا سبب بنا۔ پھر جب میری پوسٹنگ کراچی میں ہوئی تو اکثر پروگراموں کے اختتام پر انہیں دفتر کی گاڑی میں ان کے گھر پہنچانے کی ذمہ داری خود میں نے اپنے سر لے لی تھی۔ اس بہانے میں خود بھی اسی گاڑی میں گھر ڈراپ ہو جاتا جو پروفیسر صاحب کے نام پر ریکوزٹ کی جاتی تھی۔ ہمیشہ وہ ڈرائیور کو بہت محتاط رہنے اور احتیاط سے گاڑی چلانے کا مشورہ دیتے۔ کبھی کبھار تو اس کی لاپراوہی پر ڈانٹ بھی دیتے۔ روڈ ایکسیڈنٹ کا خوف ان کے لاشعور میں بیٹھا ہوا تھا جو لاہور ائیر پورٹ کے راستے میں حقیقت بن گیا۔ بظاہر کاٹن کی شیروانی' بڑے پائچے کے پاجامے اور غیر چمکدار پمپ شوز میں ملبوس ایک شخص ایکسیڈنٹ کا شکار نہیں ہوا' ایک کائنات بکھر گئی بلکہ اجڑ گئی۔ میری طبیعت کے اجاڑ ہونے کا سبب ان کائناتوں کا اجڑ جانا بھی ہے کہ میں نے دھڑ دھڑ جلتے ہوئے سورجوں کو دیکھا ہے اب مانگے کی روشنی سے ملنے والے چراغ نظروں کو روشن نہیں کرتے۔ ایسے اساتذہ اور ایسی شخصیات کو یاد کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

اگن کنڈ ہے سینہ فراق
دھڑ دھڑ جلتی ہے آگ

جمال نقوی

مجتبیٰ حسین کا سماجی وادبی شعور

اپریل کئی اور اہم واقعات کے علاوہ سماجی حقیقت نگاروں، روشن خیالوں اور ترقی پسندوں کے لیے اس وجہ سے بھی خصوصیت کا حامل ہے کہ برصغیر کی ادبی دُنیا میں ترقی پسندی کا ایک مختصر کارواں گہوارۂ علم وادب لکھنؤ کی سرزمین سے اسی ماہ کی ۱۱راور ۱۲ر تاریخ ۱۹۳۶ء کو پریم چند کی سربراہی میں اپنے ارتقائی سفر پر روانہ ہوا تھا اور پھر سجاد ظہیر کی قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

دوسری زبانوں کے علاوہ خصوصاً اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک اردو تاریخ کا ایک اہم اور روشن باب رہی ہے۔ جس نے شاعری، فکشن، تنقید اور دیگر اصنافِ ادب میں ایک انقلاب برپا کر دیا جس کے اثرات زیادہ دیرپا ثابت ہوئے اور جس نے شاعر، ادیب، نقاد، قاری اور سامع وناظر کی سوچ اور پسند میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔ ادیب کو اپنی سماجی وسیاسی ذمہ داری کا ادراک ہوا۔ داخلیت پسندی کے حصار سے نکل کر اس نے اپنے معاشرے کے حالات کا مطالعہ کیا۔ تخلیق ادب انکشافِ ذات کی قید سے باہر آیا۔ نئے شعور کے ساتھ جدید موضوعات پر طبع آزمائی ہونے لگی اور ہیئت واسلوب کے نئے تجربات سامنے آنے لگے۔ اس طرح ہمارے ادب میں وسعت وندرت اور دلکشی ورعنائی نمایاں ہونے لگی ساتھ ہی ساتھ ادب کا جمالیاتی اور افادی پہلو بھی نمایاں ہونے لگا۔ تحریک کے بنیاد گزاروں اور اس کے اول دستے کی ان کارگزاریوں میں ایسی کشش تھی کہ عاشقانِ ادب اس کی طرف کھنچتے چلے گئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین بھی اسی کارواں میں شامل تھے ان کے شعور نے ترقی پسند تحریک کی انقلاب انگیز فضا میں آنکھیں کھولیں۔ الہٰ آباد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی وہ فراق گورکھپوری کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر انھوں نے فراق صاحب کے ساتھ مل کر ''سنگم''

کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور کتابیں شائع کیں پھر بمبئی میں سررشتہ تعلیم میں ملازمت کی اور ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے پاکستان (کراچی) آ گئے۔ یہاں بھی شعبۂ تعلیم سے وابستہ رہے۔ معروف مصور و سنگ تراش آذر ذوبی کے ساتھ جریدہ 'شعور' میں بھی شریک رہے۔ اور آخری زمانے میں وہ بلوچستان یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر بھی رہے۔ اس طرح آخر وقت تک وہ علم و ادب کی شمعیں روشن کرتے رہے۔

مجتبیٰ صاحب نے اپنے ادبی سفر کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی' ان کا پہلا افسانہ ''سوچ'' ۱۹۴۳ء میں ماہنامہ نگار لکھنؤ میں شائع ہوا اور بعد میں افسانوی مجموعہ 'انتظارِ سحر' کے نام سے شائع ہوا۔ انہوں نے ڈرامے بھی تحریر کیے جن میں سے ایک 'انکار' کمال احمد رضوی کی مرتب کردہ کتاب ''اردو کے منتخب ڈرامے'' میں شامل ہے۔

انہوں نے شاعری بھی منفرد انداز میں کی ہے اور غزل' نظم و مرثیہ میں اپنے مخصوص لب و لہجہ کے جوہر دکھائے ہیں مگر وہ اپنا کلام مخصوص حلقوں میں بھی کم کم سنایا کرتے تھے۔ میں ان خوش نصیبوں میں ہوں جنھوں نے پروفیسر سحر انصاری کے مکان پر کافی عرصے تک ہر اتوار کو ان نجی محفلوں میں شرکت کی ہے جن میں عزیز حامد مدنی' پروفیسر مجتبیٰ حسین' جاذب قریشی اور دیگر احباب شریک ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں ہونے والی عالمانہ گفتگو سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور یہیں ان شرکاء کے اوّلین سامع کا کردار بھی ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے مجتبیٰ صاحب کی صدارت میں اپنا کلام بھی سنایا ہے اور پھر ان سے صدارتی کلام بھی سنا ہے۔ ان کی شاعری میں تنہائی کا احساس اور ضبطِ غم کا حوصلہ نمایاں پہلو کے طور پر نظر آتے ہیں۔ نموتناً چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

اے دوست تری پرسشِ الفت کا شکریہ
کس درجہ ہے خلوص پہ مبنی ترا کرم
اس وقت ڈبڈبائی ہوئی آنکھ پہ نہ جا
ہنس ہنس کے میں نے کاٹ دیئے ہیں ہزار غم

سببِ گریہ کہیں کیا' کہ سبب کوئی نہیں
آنکھ ہی ہے' جو بھر آئے تو عجب کوئی نہیں

خلوتِ جاں میں کبھی تھا مہ و انجم کا قیام
آ کے دیکھے جو کوئی آج تو اب کوئی نہیں
یہی جو اہلِ نظر کا شعار ٹھہرے گا
تو حرفِ حق بھی زمانے پہ بار ٹھہرے گا
یہ مرا دل ہے، محبت کی جلوہ گاہ ہے یہ
یہ آئینہ نہیں جس پر غبار ٹھہرے گا

اپنی ایک طویل نمائندہ نظم ''سوئی سے بیکٹر تک'' میں ان کی شاعری تنہائی کی تاریکیوں سے نکل کر افسانوں سے بھی فضا میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نظم میں خصوصیت سے علم، فلسفہ اور زندگی کے تجربات کے ساتھ ان کی ذات کی تکمیل کا احساس بھی ملتا ہے۔

نظم آزاد اور نظم معریٰ کے بعد نثری نظم بھی اردو ادب میں داخل ہو چکی ہے۔ ہمارے ادب نے جس طرح مشرقی داستان گوئی کے مقابلے میں افسانہ نویسی اور دیسی ماہیا کے مقابلے میں بدیسی ہائیکو کو قبولیت کا شرف دیا ہے اسی طرح نثری نظم کے تجربے کو بھی قبول کیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ تجربہ کہاں تک کامیاب رہتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس تجربے میں وہ خود شامل نہیں مگر انہوں نے اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا:

''نثری شاعری کہنے کی چیز نہیں لکھنے کی چیز ہے جیسے افسانہ کہا نہیں جاتا لکھا جاتا ہے یہ شاعری بھی ایک نوع کی افسانوی کیفیت رکھتی ہے۔ بے ترتیب زندگی کی بے ترتیب کہانی لکھنے کے لئے از خود رفتگی کی ضرورت ہے تاکہ شعوری کوشش کی گرفت نظر نہ آئے۔''(۱)

ایک اور مضمون میں ان کی شخصیت اور فن کو موضوع بنایا گیا ہے، جس میں ان کی ہردلعزیز شخصیت، علمیت اور حیثیت کے ساتھ ہی معنویت سے پُر ان کی شاعری کے بارے میں یوں تحریر کیا گیا ہے:

''ان کی شاعری میں مختلف افکار و نظریات ہیں، عہدِ حاضر کے مختلف پہلو ہیں، ایک سوچتا ہوا باخبر ذہن ہے۔ بعض نظموں میں فلسفے کے پیچیدہ نکات روانی کے ساتھ اشعار میں

ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ نروان' آواگون' تقدیر' نفی کی نفی' بدھ مت' یونانی' وغیرہ غرض مختلف افکار و نظریات اشعار کا روپ دھار کر سامنے آتے ہیں۔" (۲)

پروفیسر مجتبیٰ حسین کی نثر نگاری بھی ان کی شاعری کی طرح ان کے مخصوص لب ولہجہ اور اسلوب کی وجہ سے ان کی منفرد پہچان ہے۔ ان کی تحریریں گو کہ ترقی پسندی کی روایت کی آئینہ دار ہیں مگر ان کا زاویۂ نظر سکہ بند ترقی پسندوں سے مختلف تھا جس میں فن و جمالیات کو نظریہ کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا گیا ہے۔ ان کی تحریروں میں حیات انسانی کی مثبت قدروں کی ترجمانی' شگفتہ اسلوب کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے جس میں فلسفیانہ بصیرت' دیدہ ورانہ سیاست اور قدیم و جدید کی حلاوت شامل ہے۔ ان کی نثر نگاری کے بارے میں آج کے ایک ہم نقاد کی رائے دیکھیے' انہوں نے بھی مجتبیٰ صاحب کی اعلیٰ ادبی اقدار' زبان و بیان کی خوبصورتی اور مواد کے ساتھ ہیئت کے لازمی تقاضوں پر اصرار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تحریر کے ایک گوشے کی طرف یوں متوجہ کیا ہے:

"مجتبیٰ حسین 'ثقافت' پر اپنے خیالات کے لیے بھی یاد رکھے جائیں گے۔ وہ اپنی تہذیبی ماضی کے دفاع کیلیے میتھیو آرنلڈ کی تصنیف Culture and Anarchy (ثقافت و انتشار) کے مواعید کے قریب تر نظر آتے ہیں اور آرنلڈ نے جس یورپی کلچر کے دو اہم ستونوں مشرقی' وسطی عقائد اور یونانی' رومی ثقافت پر زور دیا ہے وہ ان کی تحریروں میں کلچر اور ادب کے حوالے سے غیر رسمی یا بالواسطہ طریقے پر بار بار در آیا کرتا تھا۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ وہ ایک زمانے میں اپنے نظریاتی ساتھیوں سے خاصے دور نظر آنے لگے تھے لیکن اگر ہم ثقافت کے مسئلے پر غیر طبقاتی فکر کے جمال پسندوں کی تحریروں کا بھی بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو ایک حقیقت بہر طور سامنے آتی ہے اور وہ ہے آرنلڈ کے کلیے سے مطابقت نہ رکھتے ہوئے بھی اس حد تک ضرور درست ہے کہ تاریخ کے بارے میں جدلیاتی مادیت کا نظریہ کسی بھی علاقے کے تہذیبی ماضی کی نفی نہیں کرتا بلکہ مرورِ ایام کے ساتھ گلشن ثقافت کے موسم خزاں کے زرد پتوں کی حیات نو کو لایعنی عمل سمجھتا ہے۔ زندگی کا نامیاتی تصور بذات خود جدلیاتی ہے۔ یہ تصور فرسودگی کی جگہ تازگی کی سند نشینی پر اصرار کرتا ہے لیکن مجتبیٰ حسین تہذیب کے بارے میں اپنے خیالات کو

باضابطہ طور پر مدوّن کرنے کے بجائے اپنے ''بلومز بری سرکل'' کے فیصلے کے طور پر پیش کرتے رہے (۳)

نثر نگاری میں افسانوی مجموعے ''انتظارِ سحر'' کے علاوہ مجتبیٰ صاحب کی ایک تحقیقی کتاب 'آغا شاعر قزلباش۔ حیات وشاعری اور تنقیدی مضامین پر مشتمل تین مجموعے ''نیم رُخ'' تہذیب وتحریر اور ادب وآگاہی تہذیبی ارتقاء کی داستان گوئی اور حیات انسانی کی مصوری کے نادر نمونے ہیں۔

ادب اور آگہی میں ادب اور نظریے کا صرف نئی اور پرانی نسل' انسانوں کی پریاں' پریم چند اور جوش اعظم ان کے چند اہم اور منفرد مضامین ہیں۔ ادب میں نظریے کا صرف کے تحت وہ نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''ادب یا کسی اور شعبے میں نظریے کے معنی شعور کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے۔ اس لیے جب نظریہ کا لفظ آئے تو اس پر پریشان یا پشیمان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے بغیر اس لفظ کے ہم کسی شے یا کسی عمل کی سمت اس کی خصوصیات اور اس کی نوعیت متعین نہیں کرسکتے چنانچہ کوئی بھی ادب ہو' کسی زمانے کا ادب ہو' اپنے نظریات ہی کی وجہ سے متعین ہوسکتا ہے اس کی روایات اس کے رجحانات' اس کی پستی یا بلندی کا اندازہ نظریات کے بغیر ناممکن ہے ہر زمانے کا ادب شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے نظریات کے ماتحت وجود میں آتا رہتا ہے جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا ادب بھی زیادہ باشعور ہوتا گیا۔ دوسرے لفظوں میں نظریات کا رجحان نمایاں طور پر ہونے لگا (۴)۔

دانائے رموز این وآں' مولائے اکابر جہاں اور شاعر آخر الزماں حضرت جوش ملیح آبادی کا نام اردو شعر وادب کے اکابرین میں شمار ہوتا ہے۔ اردو دنیا میں عاشقینِ جوش میں دوسروں کے علاوہ پروفیسر مجتبیٰ حسین کا نام بھی آتا ہے۔ جو اپنی تمام تر خواہش کے باوجود حضرت جوش کے فن وشخصیت کے بارے میں نہ تو کوئی کتاب لکھ سکے اور نہ ہی کوئی تفصیلی مضمون۔ جوش صاحب کی زندگی میں یعنی ۱۹۶۱ء میں شائع ہونے والے افکار کے جوش نمبر میں انہوں نے اپنی علالت کی وجہ سے مدیر افکار صہبا لکھنوی کے نام ایک

خط میں جوش اعظم کے عنوان سے اردو کے اس عظیم شاعر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کو ایک مبہوت کر دینے والی چیز قرار دیا تھا۔ خط نما یہ مضمون افکار جوش نمبر کے علاوہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہونے والی ان کی کتاب ادب و آگہی میں شامل ہے جوش صاحب کے انتقال کے بعد افکار بیاد جوش کے موقع پر بھی ان کی طبیعت ناساز تھی اور انہوں نے صہبا صاحب کے نام خط نما ایک مختصر ترین تحریر میں جوش صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر کیا:

''جوش کی شاعری کا احاطہ مضامین سے ممکن نہیں۔ متعدد کتابوں کی ضرورت ہے جو جوش کی ہزار شیوہ شاعری کی کچھ پرچھائیوں کو شاید پیش کر سکیں۔ ایسا شاعر اردو کیا دنیا کی کسی زبان میں اس صدی میں نہیں کسی صدی میں بھی مشکل سے ہی ملے گا۔ کون سی صنف ہے جسے جوش نے کمال کے درجے تک نہیں پہنچایا ہے۔ کون سا موضوع' کون سی فکر' کون سا جذبہ ہے' احساس' جبلت' زندگی کا کون سا ارتعاش ایسا ہے جو جوش کے یہاں شعر بن کر مجسم نہ بن گیا۔

آسماں کا داور و دارا' زمین کا کج کلاوہ

بربر کا آقا' بحر کا مولا' فضا کا بادشاہ

(۵)

اردو شاعری میں مجتبیٰ صاحب کی ایک اور پسندیدہ شخصیت شاعر حیات و کائنات اور فرشتہ امن و محبت صفات جناب فیض احمد فیض بھی تھے جن کی شاعری پر وہ ۱۹۵۲ء میں اپنے ایک طویل مضمون میں بحث کر چکے تھے اور یہ بتا چکے تھے کہ ان کی آواز پہلی بار اردو شاعری میں مغربی شاعری کی غنائیت سے آشنا ہوئی اور ان کی شاعری میں موجود اس فضا کی طرف متوجہ کر چکے تھے جو موضوع کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنے بعد کے مضمون میں انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا:

میں سوچتا ہوں کہ میں نے فیض کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے بار بار لہجہ اور فضا کا ذکر کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا فیض کی شاعری میں سب کچھ بھی ہے یا اس کے علاوہ بھی ہے۔ میرے لیے اس کے علاوہ اور شاید کچھ نہیں ہے اور جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب ضمنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان کا سیاسی شعور' ان کی ترقی پسندی' ان کی انسان دوستی سب

اسی فضا کو تعمیر کرتی ہیں اور اسی فضا سے ابھرتی بھی ہیں۔(۶)

فکشن کی دنیا میں انہوں نے مجموعی اعتبار سے اردو افسانہ نگاری کے رجحانات اور اردو ناول کے ارتقاء کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور پریم چند کے علاوہ قرۃ العین حیدر کے دو اہم ناولوں آگ کا دریا اور گردش رنگ چمن کا تفصیلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ان کے مطابق میرے بھی صنم خانے' سفینہ غم دل اور آگ کا دریا ایک پورے سلسلے کو سمیٹ لیتا ہے۔یہ سلسلہ تہذیب کی قوت' یادوں کے خواب اور ایک لامتناہی جستجو کا ہے۔آگ کا دریا پر ان کا مضمون ادب و آگہی میں شامل ہے اور گردشِ رنگ چمن کے بارے میں اپنی زندگی کا آخری طویل مضمون انہوں نے ۱۹۸۹ء میں تحریر کیا تھا جو بعد میں افکار کے پچاس سالہ انتخاب میں بھی شامل کیا گیا اس مضمون کے اختتامی کلمات میں انہوں نے تحریر کیا:

''آگ کا دریا کے بعد' گردشِ رنگ چمن' قرۃ العین کا دوسرا اہم ترین اور کہانی کے لحاظ سے سب سے کامیاب ناول ہے۔اس کا بیشتر حصہ زمین پر لکھا گیا ہے۔آگ کا دریا ہمالیہ کا سلسلہ ہے اور گردشِ رنگ چمن ہمالیہ سے پھوٹی ہوئی گنگا ہے جس کا پاٹ میدان میں پہنچ کر اتنا چوڑا ہو گیا ہے کہ ایک کنارے پر کھڑے ہو کر دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا۔دور تک دھند پھیلی ہوئی ہے۔ہم سب ایک کنارے پر کھڑے ہیں' دوسرے کنارے کو دیکھنے میں کوشاں ہیں۔دوسرے کنارے پر کیا ہے کون ہے' گردش رنگ چمن ایک مسلسل سوال ہے۔قرۃ العین حیدر یہ ناول بھی لکھ چکیں۔اب انہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے یا نہیں؟(۷)

اسی سال یعنی ۱۹۸۹ء میں وہ جمہوریت پسند مصنفین کے کنونشن منعقدہ لاہور میں بلوچستان کے وفد کے ساتھ شریک ہوئے جہاں انہوں نے ایک مقالہ پیش کیا اور ایک اجلاس کی مجلس صدارت کے رُکن بھی مقرر ہوئے مگر افسوس کہ یہ اجلاس اور ان کی یہاں کی گفتگو ہی دنیائے ادب میں آخری ٹھہری اپنے اس مضمون کا اختتام میں ان کے لیے پیش کیے گئے ایک خراج عقیدت کے ان اختتامی الفاظ پر کروں گا:

''وہ دانشوروں اور ادیبوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کا کمٹمنٹ سماجی

زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے ہمیشہ پیوستہ رہتا ہے۔ انسانی دوستی ان کی رگ و پے میں سرائیت کیے ہوئے تھی۔ وہ صلح جو اور خلوص و محبت کا پیکر تھے اور انہوں نے اپنی محبتوں کو بانٹنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام ایک ایسی کانفرنس میں شرکت میں گزرے جو ہم عصر معاشرے کا مرکزی موضوع بنا ہوا ہے یعنی جمہوری عمل کا فروغ۔ لاہور میں جمہوریت پسند مصنفین کی سہ روزہ کانفرنس معاشرے میں غیر جمہوری نظریات اور ان کے عملی مظاہرے کے خلاف اور جمہوری عمل کی تائید میں ادیبوں کی حمایت کے اظہار کے لیے منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ان کی پر جوش شرکت سماج سے ان کی کمٹمنٹ پر دلالت کرتی ہے (۸)

حوالہ جات

(۱) مجتبیٰ حسین، کچھ نثری شاعری کے بارے میں، مشمولہ ماہنامہ نئی قدریں، سلور جوبلی نمبر حیدر آباد سندھ، ۱۹۸۰ء ص ۱۷۹

(۲) ڈاکٹر فردوس انور قاضی مجتبیٰ حسین مشمولہ سہ ماہی تمثال کراچی شمارہ ۱، ۲، ۱۹۹۲ء ص ۱۴۵۔

(۳) ڈاکٹر محمد علی صدیقی 'اشاریے' مکتبہ افکار کراچی ۱۹۹۴ء ص: ۱۷۲۔۱۷۳

(۴) مجتبیٰ حسین ادب و آگہی مکتبہ افکار کراچی ۱۹۶۴ء ص ۷۵

(۵) پروفیسر مجتبیٰ حسین آنکھیں ہتھیلیوں سے مل...... مشمولہ افکار بیاد جوش کراچی ۱۹۸۲ء۔ ۴۰۶

(۶) پروفیسر مجتبیٰ حسین کچھ فیض کے بارے میں، مشمولہ افکار فیض نمبر کراچی ۱۹۶۵ء ص ۳۳۳

(۷) پروفیسر مجتبیٰ حسین، گردش رنگ چمن ایک مطالعہ مشمولہ افکار مضامین نمبر کراچی ۱۹۹۵ء ص ۲۴۱

(۸) مسلم شمیم آدرش جاوداں پبلی کیشنز کراچی ۱۹۹۹ء ص: ۱۸۴۔

انیس باقر

محبت کی بارگاہ......مجتبیٰ حسین

میرا اسلام ہوا ابا جانی پر جنہوں نے بسم اللہ کے بعد سرکنڈے کو چھیل کر قلم بنایا، تختی پر ملتانی مٹی بھگو کر اس کو پیلا کر دیا، روشنائی ایک دوات میں ڈالی اور لکھنا سکھایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب انہوں نے پہلی بار میرے انگوٹھے، شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو دبا کر مخروطی شکل دی اور ان کو اس طرح ترتیب دیا کہ ان کے درمیان قلم پھنس جائے پھر مٹھی سختی سے بند کرنے کی ہدایت دی اور رفتہ رفتہ میرے ہاتھ کو جنبش دی، یہ میرے قلم کی پہلی جنبش تھی اردو زبان کی آواز کو تختی پر قلم بند کیا۔ یہ ایک نیا اور چونکا دینے والا عمل تھا جیسے میں بڑا ہو گیا۔ عمر کے اضافے کے ساتھ انگریزی زبان کے حروف، اعداد اور پھر الفاظ کی ادائیگی پر زور دیا۔ دوران تعلیم وہ اپنے طلبا کو محض نصاب نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ تہذیب وتمدن، تاریخ وادب کے پڑھانے کے ساتھ، ایسی تعلیم سے نوازتے تھے کہ دیکھنے والا یہ سمجھ لیتا تھا کہ یہ شخص کس دبستان سے فیض یاب ہوا، ہر لفظ کو ناپ تول کر ادا کرنا، الفاظ کی ادائیگی اور تلفظ کا خاص خیال رکھنا وہ عمر بھر اپنے طالب علموں کی زبان اور بیان کی اصلاح کرتے رہے، وہ آئین اور اودھ کی سرزمین کی خوشبو لے کر گومتی ندی اور گنگا جمنی تہذیب کی گود میں ضلع جونپور کے ایک گاؤں سنجر پور کے حویلی نما گھر میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے یہ گھر زندگی کی تمام آسائشوں سے لبریز تھا۔ والدہ صاحبہ قمرالنساء بی بی نے ان کو بڑے ناز ونعم سے پالا کیوں کہ آپ تقریباً دس برس کے بعد پیدا ہوئے انہیں تمام عمر منّے کے نام سے پکارتی رہیں، والد صاحب میر سید باقر حسین زمینداری کے علاوہ فرسٹ کلاس مجسٹریٹ تھے۔ ابھی ان کی عمر تقریباً ۱۴ برس کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا مگر ان کے بڑے بھائی جو سید مصطفٰے حسین نے تعلیمی میدان میں ان کی رہنمائی کی جو عمر میں ان سے تقریباً بیس برس بڑے تھے اور انکم ٹیکس آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ میر باقر حسین نہایت منکسر المزاج اور درویش صفت آدمی تھے ایک مرتبہ ان کی عدالت میں چرواہے نے ان کے سگے بھائی سید غضنفر حسین کے خلاف دعویٰ دائر کیا جو ان کی عدالت میں آیا مگر اس کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور کسی قسم کا

خوف یاد باؤ اس پر نہ ڈالا' تحریک پاکستان نے جب جنم لیا اس اور گاؤں گاؤں قریہ قریہ شور مچا تو وہ بھی جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور اس نوزائیدہ ملک کی محبت میں گرفتار ہوئے۔ گھر کو تالا لگایا چھوٹی بہن شمیم جو اس وقت جونپور شہر میں مقیم تھیں اور سید ابو طالب رضوی رجسٹرار کی زوجہ تھیں بھرے گھر کو چھوڑ کر تالا لگایا اپنے ہمراہ دو عدد گھریلو ملازمین کو لے کر پاکستان چلنے کا قصد کیا۔ والد صاحب کا شجرہ نسب کچھ یوں ہے، جس کا تفصیلی ذکر کرنے کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے مگر مختصراً یہ ہے:

فیروز شا تغلق کے دور میں جونا شاہ نے شہر جونپور بسایا

مالک الملک — سید جلال الدین

سید محمد ساکن شیراز — سالار لشکرِ ہند

قاضی سلطنت ہند

سید قطب الدین المعروف ملک یمنیہ

سید محمد

سید محمد ذکریا

ملک سید محمد محبوب

ملک سید محمد ارشد

ملک سید محمد اختر (جاگیر دار پرگنہ انگلی جونپوری ۱۸۵۷ء کے مجاہد آزادی تھے)

ملک سید غلام اکبر

ملک سید عوض علی

ملک سید محمد رؤف

ملک شرف الدین — ملک سید ریاض الدین

اس کے بعد مزید چار پشتوں کے بعد:

سید بندے علی

سید محمد عبداللہ اور ان کے فرزند — سید باقر حسین

سید مصطفےٰ حسین — سید مجتبیٰ حسین

سید مجتبیٰ حسین کے فرزندان

سید انیس باقر　　　　　سید اقبال باقر

سید عباس باقر　　اور　　سید غالب باقر ہیں

راقم کا ایک بیٹا سید مصطفیٰ باقر اور دو بیٹیاں اریبہ اور گیتی آراء ہیں جو شادی شدہ ہیں۔ یہ سلسلہ نسب حضرت زید شہید سے جاملتا ہے۔ والد صاحب جب کبھی خاندانی موضوعات اور حسب و نسب پر باتیں کرتے تو یہ مصرع پڑھتے:

ہم باقیاتِ حضرت زید شہید ہیں

مگر پاکستان ہجرت کے بعد انہوں نے لفظ سید کا استعمال ترک کر دیا ماسوائے اس کے جب کبھی کسی جگہ اس کو ضرورتاً استعمال کرنا ہو مثلاً بچوں کے داخلے یا دستاویزات پر جہاں مجبوری ہو۔ اور نہ اس رعایت سے انہوں نے پاکستان میں کوئی کلیم (Claim) حاصل کیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے ابتدائی ایام میں سنجر پور میں دادا پردادا اور اپنے اجداد کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی' الہٰ آباد جا کر فراق گورکھپوری صاحب سے ملاقات کی اور سنگم پریس' پہلا آرٹ پریس جو انہوں نے الہٰ آباد میں لگایا تھا فراق صاحب کے سپرد کیا' اپنی بہن عزیز و اقارب سے ملاقات کی۔ لکھنو' الہٰ آباد' فیض آباد میں اعزا و احباب کو خدا حافظ کیا اور والدہ صاحبہ دو عدد ملازمین امی جان اور مجھے گود کا بیٹا اقبال باقر کو لے چند یوم بمبئی میں قیام کیا۔ مال و اسباب نہ ہونے کے برابر' ڈیڑھ دو کلو سونے کے زیورات' کچھ اشرفیاں' گینیاں' اس وقت کے بارہ ہزار روپے لے کر نکل پڑے۔ بمبئی سے بحری جہاز میں بیٹھ کر کراچی آن پہنچے۔ ابتدا میں چند یوم گرومندر پر اپنے دیرینہ دوست کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رہنما عزیز سلام بخاری کے گھر قیام فرمایا مگر کامریڈ سلام بخاری حکومت کے خلاف سرگرم تھے وہ روپوشی کے عالم میں کام کرتے تھے انکے سگے بھائی طیب بخاری جو ایک معروف صحافی تھے کے ساتھ وقت گزارا مگر طیب بخاری صاحب کی بیگم نہایت تیز خاتون تھیں روز والدہ اور دادی صاحبہ کو اپنے مکان سے نکل جانے کا کہتی تھیں' تعلقات کشیدہ تر ہوتے گئے لہٰذا والد صاحب نے قصد کیا کہ وہ اب اور کہیں قیام کریں گے۔ ۱۰۰ گز کے جہانگیر کوارٹر میں بالآخر وہ اپنے ایک دوست عبدالستار صاحب کے یہاں رہائش پذیر ہو گئے' عبدالستار صاحب کا گھر چھوٹا مگر دل بڑا تھا وہاں تقریباً سال بھر گزارا بعد میں وہ بہار کالونی منتقل ہو گئے یہ بھی کرائے کی رہائش تھی دیار غیر اور

کوئی آمدنی کا ذریعہ اس وقت تک نہ تھا۔ رقم ختم ہو رہی تھی پھر اشرفیاں بکنے لگیں۔ دادی صاحبہ ہوتی تھیں اور صرافہ مارکیٹ ہر ماہ کا معمول بن گیا تھا۔ ایم اے اردو میں فرسٹ کلاس فرسٹ' انگریزی زبان اور لٹریچر پر عبور رکھنے والے مجتبیٰ حسین پر اس شہر میں ملازمت کے دروازے بند تھے' جبکہ کراچی دارالسلطنت تھا اور حکومتی معاملات کے لیے پڑھے لکھے افراد کی کمیابی تھی مگر نظریات کی جنگ جو مسلم لیگ اور ترقی پسندوں کے مابین تھی وہ عروج پر تھی۔ مسلم لیگ پر ابن الوقتوں کا قبضہ بڑھتا گیا مغرب کی جانب ان کا جھکاؤ روز بروز بڑھتا رہا۔ قائد اعظم کے ساتھ جو ٹیم تھی ان کے اثر رسوخ کم ہو چکے تھے اور خصوصاً ان کی وفات کے بعد اقتدار کا سورج ان لوگوں کے لئے طلوع ہوا جو اپنے سرمایہ کو دوام بخشنے کے لئے سرگرم تھے ایسی صورت میں ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی سجاد ظہیر کی رہنمائی میں مغربی پاکستان میں سرگرم ہوئی یہاں تک کہ راج ڈولنے لگا۔ سیاست دانوں نے فوجی جرنلوں سے اپنے تعلقات میں اضافہ کیا اور اپنی ڈولتی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے تدبیریں شروع کر ڈالیں' پوری دنیا سوشلزم کے نعروں سے گونج رہی تھی عرب دنیا میں نیشنلزم کی آواز بلند تھی' گراں خواب چینی اپنی حکومت قائم کر چکے تھے' سوشلزم کے سیلاب کو روکنے کے لیے حکومت اور امریکا گٹھ جوڑ عروج پر تھا' ادیب دانشور' مزدور کارکن ہاری تنظیموں کے دفتروں پر چھاپے اور گرفتاریاں معمول بن گیا تھا گو کہ والد صاحب سرگرم سیاسی کارکن نہ تھے مگر ان کا قلم اور ان کی آواز انقلاب کی دھیمی بانسری سے کم نہ تھی ایسی صورت میں آسودگی کہاں۔ دیار غیر اور سخت مشکلات کا دور' بچے بڑے ہونے لگے' ساتھ میں دو عدد آبائی ملازمین کا خرچ' پھر حکومت کی جانب سے سختیاں۔ جس کالج یا یونیورسٹی کا رخ کرتے انٹرویو کے بعد یہ جواب ملتا کہ آپ زیادہ پڑھے لکھے ہیں ہمیں نارمل تعلیم یافتہ استاد کی ضرورت ہے۔ ملک میں اقتصادی ترقی کوئی نہ تھی خواجہ ناظم الدین کو مرغ لڑانے کا شوق تھا پھر مغربی اور مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج نے ملک کے حالات کو اور پیچیدہ کر دیا۔ ۱۹۵۳ء کی طلبہ تحریک جس کو بائیں بازو کے ترقی پسندوں کی حمایت حاصل تھی اس نے حکومت پر کاری ضرب لگائی اور حکومت کمزور ہوتی گئی۔ دوسری جانب فوج میں بڑھتی ہوئی بے چینی دائیں اور بائیں بازو کی کشمکش سے یہ بھی محفوظ نہ تھی جنرل اکبر خان' کیپٹن فیض احمد فیض اور دیگر افسران نے موجودہ حکومت کے خلاف عدم اعتماد ظاہر کیا مگر جنرل ایوب خان اور دیگر جرنیلوں نے اس انقلاب کی سن گن لے لی۔ سید سجاد ظہیر اور کمیونسٹ پارٹی نے فوجی بغاوت کا ساتھ نہ دیا نتیجہ یہ ہوا کہ

حکومت نے بڑا ڈھول پیٹا اور فوجی امداد کے لیے بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا تا کہ اقتصادی امداد کے لئے امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے مال پکڑا جائے۔ سوشلسٹوں پر کریک ڈاؤن ہوا یہ کریک ڈاؤن اس سے شدید تھا جو آج کل شدت پسندوں پر ہے مگر یہ تحریک عوامی نوعیت کی تھی اس میں بندوق اور ہتھیار نہیں عوام کی امنگیں اور ان کے مطالبات تھے حکومت سوانگ پر امریکا نے لبیک کہا اور اس طرح فوج اور نوکر شاہی نے مل کر حکومت مضبوط کرلی۔ سید سجاد ظہیر بھارت واپس چلے گئے۔ گھر چھوڑ کر نئے ملک میں آنے والوں کو ملک دشمن کہا جانے لگا۔ اخبارات میں ان کے خلاف زہر اگلا جانے لگا اور نتیجہ یہ ہوا کہ میر باقر حسین کے فرزند مجتبیٰ حسین کی حب الوطنی پر شک کیا جانے لگا گو کہ جب قائد اعظم کی وفات ہوئی تو والد صاحب دن بھر روتے رہے جیسے ان کے گھر کا کوئی فرد مر گیا اور ان کی روح بیقرار رہی۔ انہوں نے شدت جذبات میں ایک ایسی نظم کہہ ڈالی جس میں قائد اعظم کی شخصیت اور والد صاحب سے ان کی والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے یہ نظم تقریباً ۲۰۰ راشعار پر مشتمل ہے جس کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

پھر بھی دل کو نہیں ہے صبر و قرار
لب پہ آہیں ہیں اشک جاری ہے

زندگی کھو گئی فضاؤں میں
سربلندی نہ خاکساری ہے

ولولے سرد حوصلے مجروح
سینہ زخمی ہے ضرب کاری ہے

اب نہ سود و زیاں نہ عقل و جنوں
بس رگوں میں جمود طاری ہے

بام و در اور کوچہ و بازار
سب ہیں سنسان سوگ طاری ہے
دفتر ہست و بود ہے برہم
اٹھ گیا آج قائد اعظم

دس پندرہ بند کے بعد فرماتے ہیں:

جس کی بیگانگی پہ شیدا تھا
آہ وہ رسم دوستی نہ رہی
وہ مجاہد وہ سرفروش کہاں
سطوتِ عزم اپنی نہ رہی
تجھ کو شمع مزار کیا معلوم
بزم عالم کی روشنی نہ رہی
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
فلک میں اک چراغ تھا نہ رہا

یہ چند اشعار جو ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کی دہائی میں بے حد مشہور ہوئے۔

کون جانے گا درد مجبوری
حالت زار کس کو سمجھائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
تیری الفت میں گھر لٹا بیٹھے
تیری الفت میں ناصبور ہوئے

اس کے باوجود ۱۹۵۰ء کی دہائی بڑی مشکلات میں گزری کبھی انڈر گراؤنڈ (Under ground) تو کبھی دوسروں کے یہاں رہائش اس طرح گھر کے لئے اور کرب و بے چینی رہی گو کہ جس جگہ سے انہوں نے

ہجرت کی تھی' چیف کمشنر کراچی جناب اے ٹی نقوی بھی وہیں سے تعلق رکھتے تھے مگر کیا مجال جو ان کے در پر جاتے۔ ۱۹۵۵ء کے وسط میں حکومت امریکا سے امداد لے چکی' معاہدے کر چکی تو پھر کریک ڈاؤن میں کمی آئی ویسے بھی ملک میں ترقی پسند تحریک مضبوط ہو چکی تھی مگر والد صاحب نہ مزدور لیڈر تھے اور نہ ہاری رہنما جیسا کہ کامریڈ عزیز سلام بخاری' حسن ناصر شہید اور دیگر افراد لہٰذا حکومت نے ان کی سرگرمی کا اس قدر نوٹس لینا چھوڑ دیا رفتہ رفتہ ایسا وقت آیا کہ ریڈیو پاکستان سے جناب ذوالفقار علی بخاری والد صاحب کو پروگراموں میں بلانے لگے۔ ان کے ڈرامے نشر ہونے لگے اور کسی قدر گھر کے معاشی حالت میں بہتری آئی۔ ۱۹۵۶ء میں اس وقت گھر کے حالات میں مزید بہتری آئی جب عوامی جمہوریہ چین کے سفارتخانے میں انہیں صحافت کی ملازمت ملی' جہاں اردو سے انگریزی میں تراجم ہوتے تھے مگر یہ ملازمت بہ مشکل تین سال چلی ہوگی کہ ۸ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں مارشل لا لگ گیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے اقتدار سنبھال لیا۔ چند ماہ تک تو ایوب خان سیاسی محاذوں پر ڈٹے رہے بعد ازاں انہوں نے امریکی مفادات کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک روز شام کو گھر پر ایک شخص آیا ان دنوں میں چھٹی ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس نے کچھ دیر والد صاحب سے گفتگو کی پھر چلا گیا' معلوم ہوا کہ والد صاحب اب یہ ملازمت چھوڑ رہے ہیں۔ دادی صاحبہ نے پوچھا کہ کیا سفارت خانے کے سفیر وانگ شو نے کچھ کہا' والد صاحب نے کہا کہ حکومت کچھ ایسے کام میرے سپرد کرنا چاہتی ہے جس کو میں نہیں کر سکتا۔ اب پھر ایک مشکل دور شروع ہو رہا تھا مگر اس ملازمت نے بنیاد مضبوط کر دی تھی اور چند برسوں کے بعد ملک میں سیاسی بہتری پیدا ہونے لگی خصوصاً ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد والد صاحب کو تدریسی دنیا میں جناب پروفیسر حسن عادل صاحب کے شعبۂ اردو (National College) میں لکچرار کی ملازمت دی اور یہی وہ سیڑھی تھی جہاں سے والد صاحب نے اپنی محفل سجائی' جوش ملیح آبادی صاحب' فیض صاحب' عزیز حامد مدنی' یحییٰ سلام' اور ملک کے دیگر شاعر و ادیب سے انکا رابطہ بڑھتا گیا بعد ازاں جب انہوں نے راجہ صاحب محمود آباد کی زیرِ نگرانی سراج الدولہ کالج کی بنیاد رکھی تو وہ ملک میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے۔ چند برس وہ اس کالج کے پرنسپل رہے۔ مشاعرے سے مباحثے نے اس کالج نے بہت نام حاصل کیا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد جناب غوث بخش بزنجو ناظم آباد گھر پر آئے اور کوئٹہ میں شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے ان کی تقرری کی۔ غوث بخش بزنجو صاحب بلوچستان کے گورنر اور مضبوط ترین شخصیت تھے لہٰذا ان کی حمایت میں یہ شعبہ پروان چڑھا گومتی اور گنگا جمنا کی تہذیب

کا جو بیج وہ لے کر چلے تھے اس کی تخم ریزی کے لئے بلوچستان کی سخت اور سنگلاخ چٹانیں بے حد بار آور ثابت ہوئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے' آڑو' انار' انگور اور بادام کی سرزمین میں نخلِ اردو بڑی تیزی سے پروان چڑھنے لگا۔ لوگ جوق در جوق ان کے ڈیپارٹمنٹ میں داخلے لینے لگے' گھر پر دن رات لوگوں کی آمد و رفت لگی رہتی۔ والد صاحب کی مقامی لوگوں سے بڑی دوستی ہوگئی' ان کی آزاد خیالی' سامراج دشمن سوچ' مساوات انسانی ہمدردی' علم سے لگاؤ' درس و تدریس کی محفل کا بلوچستان یونیورسٹی کے اوقات کے بعد بھی جاری رکھنا ان کا ایسا قدم تھا جس نے بلوچستان کے طول و عرض میں انہیں اتنا مقبول کر دیا جیسے وہ پشت در پشت سے یہیں کے ساکن ہیں جب بھی ریٹائرمنٹ کی تاریخ قریب آتی مزید اضافہ ہو جاتا۔ وہ دالبندین سے لے کر ڈیرہ بگٹی تک ہر دلعزیز تھے۔ اکبر بگٹی' گورنر رحیم الدین' عطا اللہ مینگل' غوث بخش بزنجو کے علاوہ پشتون علاقوں کے لوگ بھی ان کے معترف تھے' ان کی بلوچ تہذیب و تمدن سے محبت تھی' وہاں کی وادیوں' ریگستان اور آبشاروں سے محبت' گلی کوچوں میں شاگردوں اور استادوں کے ہمراہ سفر کرنا ایسا قدم تھا کہ لوگ ان کو اپنا باپ بھی گردانتے تھے ان کے قریبی دوستوں میں پروفیسر جمالدینی قابل ذکر ہیں کراچی سے انہوں نے جن لوگوں کو کوئٹہ بلایا ان میں پروفیسر سحر انصاری' پروفیسر شمیم احمد ان کے ہمسفر بنے۔ انہوں نے کئی طالبات کو پی ایچ ڈی کی سند سے ہمکنار کیا اور بعض طلبا نے والد صاحب پر ایم فل لیا مگر وہ درویش صفت آرائش گیتی میں مصروف رہا۔ بلوچستان کے طلبا کی فکری' نظری' ادبی تربیت کرنے میں وہ ہمیشہ مصروف رہے یہاں تک کہ ایک رات میں نے ۲۲ مارچ ۱۹۸۹ء کو ایک بھیانک خواب دیکھا کہ دادی صاحبہ گھر آئی ہیں اور وہ یہ کہہ رہی ہیں اب نرجس (میری والدہ) کا کیا ہوگا' فجر کا وقت تھا یہ جملہ سنا میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ان دنوں میں کراچی میں مقیم تھا ایسا لگا کہ ان کی زندگی کو شدید خطرہ ہے۔ میں نے ان کو ارجنٹ میل سروس (Urgent Mail Service) سے خط بھیجا کہ آپ کی جان کو شدید خطرہ ہے' آپ باہر نہ نکلیں محض چند دنوں کی بات ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ انیس تو ہم پرست ہو گئے' اتفاق سے پیپلز پارٹی کا ایک کنونشن لاہور میں منعقد ہونا تھا بلوچستان سے بھی ایک وفد بے نظیر صاحبہ نے بلایا تھا۔ والد صاحب گئے اور یکم اپریل کو کراچی واپس آ رہے تھے کہ صبح گیارہ بجے انہوں نے مجھے فون کیا کہ ایئر پورٹ مجھے لینے آ جاؤ مگر گیارہ بجے فون آیا کہ وہ حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ میں سمجھا کہ یہ اپریل فول ہے مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مجھے ان کا تابوت اٹھانا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو' بی بی سی' پی ٹی وی اور دیگر

اداروں نے کہا بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر مجتبیٰ حسین حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اہل علم و دانش، درس و تدریس کی دنیا اجاڑ ہو گئی، میری امیدوں کا نخل خشک ہو گیا، ائر پورٹ پر فخر زماں صاحب تابوت کے ہمراہ تھے، بلوچستان میں کہرام تھا وہ کراچی یونیورسٹی میں بھی ایک تحریک کو جنم دینے والے تھے اردو زبان کی وہ تحریک جو تہذیب کی علامت ہو اور بدلتے وقت کے تقاضوں کو لے کر چلے مگر وہ ایسا نہ کر سکے، ان کے ہزاروں شاگردوں میں رئیس علوی، ہلال نقوی، پروین جاوید (مرحومہ)، اردو کے ممتاز شاعروں ادیبوں نے انہیں منظوم اور نثری خراج عقیدت پیش کیا۔ وہ کسی سے زیادہ دیر تک روٹھے رہنے کو بہت برا سمجھتے تھے ان کا دل شیشے سے زیادہ شفاف اور روشنی کے مانند منور تھا۔ ان کا یہ شعر مسلسل ان کے دل کے چراغ کی نہ بجھنے والی ضو ہے

یہ میرا دل ہے محبت کی بارگاہ ہے یہ
یہ آئینہ نہیں جس پر غبار ٹھہرے گا

جمال نقوی

پروفیسر مجتبیٰ حسین کے فرزند غالب باقر سے ایک مکالمہ

پروفیسر مجتبیٰ حسین کے سب سے چھوٹے بیٹے غالب باقر ہیں جنہوں نے مصوری کا شعبہ اختیار کیا ہے۔ ان کی تصاویر کی نمائش کئی بار منعقد ہو چکی ہے اور صاحبانِ آرٹ کے حلقے میں انہیں پذیرائی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ وہ مصوری کے شعبے میں درس و تدریس کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے بارے میں ان سے کی گئی گفتگو قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے جو گھر کی گواہی کی حیثیت رکھتی ہے:

ج: غالب باقر صاحب آپ کو اس بات پر یقیناً فخر ہوگا کہ آپ اردو ادب کی اہم شخصیت پروفیسر مجتبیٰ حسین کے فرزند ہیں، مگر نام کی بنیاد پر بظاہر آپ کا کوئی تعلق مجتبیٰ صاحب سے نظر نہیں آتا اس کی کیا وجہ ہے؟

غ: تعلق تو ہے، اس لیے کہ سید باقر حسین میرے دادا کا نام تھا اور ابا کو اردو شعراء سے محبت تھی اس لیے انہوں نے ہم سب بھائیوں کے نام انیس اور اقبال وغیرہ کے ناموں کو دادا کے نام کے ساتھ ملا کر بنا دیئے۔

ج: ہاں! آپ نے درست فرمایا اس سے ان کی غالبؔ سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ تو یہ بتایئے کہ کیا انہوں نے غالبؔ پر نظم یا نثر میں کوئی بڑا کام کیا؟

غ: نہیں وہ ایسا کوئی بڑا کام تو نہیں کر سکے لیکن وہ اس طرح کے کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر موت نے انہیں فرصت نہ دی۔

ج: کیا آپ مجتبیٰ صاحب کی پیشہ ورانہ اور دیگر مصروفیات کے بارے میں کچھ ہمارے قارئین کو بتانا پسند کریں گے۔

غ: جب تک وہ سراج الدولہ کالج کراچی میں تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے، کالج ان کی وجہ سے ادب کا مرکز بنا رہا اور جب وہ کوئٹہ (بلوچستان) چلے گئے تو وہاں کی ادبی محفلوں کی رونق ان کے دم سے دوبالا ہوگئی۔ گورنر بلوچستان کی اہلیہ ثاقبہ رحیم الدین کے ساتھ مل کر انہوں نے 'قلم قبیلہ' قائم کیا جس نے بلوچستان میں اردو ادب کے لئے بہت اہم کام انجام دیئے۔

ج: آپ مجتبیٰ صاحب کے کچھ طالب علموں سے قارئین کا تعارف کرانا پسند کریں گے؟

غ: بحیثیت استاد مجتبیٰ صاحب کو اپنے تمام شاگردوں سے محبت تھی مگر محمد رئیس علوی، نسیم نیشو فوز، شمی فاروقی اور اقبال فریدی ان کے چند ہونہار شاگرد ہیں جو ان سے بہت قریب رہے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئٹہ کی ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا نام بھی مجھے یاد آ رہا ہے اور ڈاکٹر فاروق بھی ان کے عزیز شاگردوں میں شامل تھے۔

ج: آپ کے والد کے علاوہ ننھیال یا ددھیال میں علم و ادب کی کوئی اہم شخصیات گزری ہیں، تفصیل کے ساتھ ان کے بارے میں بتائیں؟

غ: میرے ایک چچا سید ارتضیٰ حسین سفیر پاکستان بھی تھے جنہیں علم و ادب کا ذوق و شوق بھی تھا۔ انگریزی کی کئی کتابوں کے علاوہ ''معروضات'' ان کی تنقیدی تحریروں اور تقریروں کا انتخاب ہے۔

ج: آپ نے تعلیم کس شعبے میں اور کہاں سے حاصل کی؟ کیا یہ شعبہ آپ نے خود پسند کیا تھا یا والد کی مرضی سے منتخب کیا تھا؟

غ: والد صاحب نے تعلیم کے سلسلے میں اپنے بچوں پر کوئی جبر نہیں کیا بلکہ انہیں اجازت تھی کہ وہ جس شعبے میں چاہیں تعلیم حاصل کریں۔ مصوری ابتدا ہی سے میرا شوق رہا۔ شاید یہ شوق مجھے اپنے پردادا سیّد بندے علی ماہر طغری نویس سے ورثے میں ملا ہے۔ میں نے اپنے والدین کی اجازت سے کراچی اسکول آف آرٹس سے تعلیم حاصل کی اور مصوری کو اپنا پیشہ بنایا۔

ج: ادب جس سے ان کی پیشہ ورانہ اور نجی وابستگی تھی، اس کے بارے میں بھی انہوں نے کیا اپنے بچوں کو کچھ تربیت دی؟

غ: ابا ہم بچوں کو ادبی کہانیاں مثلاً نیلی چھتری، بہرام اور آرائش محفل وغیرہ سنایا کرتے تھے

اس کے علاوہ انیس، دبیر اور غالب کا کلام بھی سناتے تھے۔ ہمارے گھر میں ادبی محفلیں بھی ہوا کرتی تھیں جن میں جوش ملیح آبادی، مرزا ظفر الحسن، فیض احمد فیض، سراج الدین ظفر، حمایت علی شاعر، صہبا اختر وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے۔

ج: آپ کے گھر میں مذہب اور ادب کے روابط کیسے رہے ہیں؟

غ: ہمارے یہاں مذہب اور ادب کے روابط گہرے اور مستحکم رہے ہیں۔ ابا شاعری اور تنقید کے علاوہ مرثیہ بھی کہتے اور پڑھتے تھے۔

ج: مجتبیٰ صاحب کی شائع ہونے والی کتابوں کے علاوہ منتظر اشاعت کتب کے بارے میں بھی بتائیں۔

غ: ان کی شائع ہونے والی کتابوں میں:

انتظارِ سحر (افسانوی مجموعہ)، انکار، اہرمن، بن بلایا مہمان وغیرہ (ڈرامے)، تہذیب و تحریر، ادب اور آگہی، نیم رخ (تنقید)، آغا شاعر قزلباش (تالیف)

اور منتظر اشاعت کتب میں، اردو مرثیہ عہد بہ عہد، اور شعری مجموعہ شامل ہیں۔

ج: اپنی یادداشت کے سہارے بتائیں کہ ادب کی کون سی شخصیات آپ کے گھر آتی رہی ہیں۔

غ: چند لوگوں کا تذکرہ تو پہلے کر چکا ہوں۔ ان کے علاوہ عزیز حامد مدنی، سحر انصاری، انجم اعظمی، سلیم احمد اور عطا شاد وغیرہ۔

ج: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مجتبیٰ صاحب پر کتنے لوگوں نے پی ایچ ڈی مکمل کی ہے؟

غ: ویسے تو کئی لوگوں کے بارے میں سنا ہے مگر کوئٹہ کے بیرم غوری کا نام مجھے یاد ہے۔

ج: مجتبیٰ صاحب کے تخلیقی کرب کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔

غ: وہ زیادہ تر راتوں میں لکھا کرتے تھے۔ وہ سگریٹ سلگا لیتے اور اپنے بستر پر بیٹھ کر لکھتے رہتے۔ ان کی تحریروں کی پہلی سامع میری والدہ تھیں۔

غالب باقر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمارے قارئین کو اپنے والد پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب کی نجی زندگی کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔

صحرا میں سائبان

منظوم خراج تحسین

حامد علی سیّد

شہر سخن کی جان رہے مجتبیٰ حسین
اردو ادب کی شان رہے مجتبیٰ حسین
تیرہ شبی کو نور انہوں نے نہیں لکھا
سچائیوں کا مان رہے مجتبیٰ حسین
پھولی پھلی زمین ادب آپ کے طفیل
صحرا میں سائبان رہے مجتبیٰ حسین
حرمت کہ حرف حرف کی ان کو عزیز تھی
لفظوں کے ترجمان رہے مجتبیٰ حسین
روشن کیے ہزارہا تحقیق کے دیئے
تنقید کی زبان رہے مجتبیٰ حسین
شہرِ سخن کے کہنہ ادیبوں کے واسطے
بن کر اک امتحان رہے مجتبیٰ حسین
جس کی ہر ایک سطر میں حامدؔ تھی روشنی
لکھتے وہ داستان رہے مجتبیٰ حسین

☆

اپنی افسانہ نگاری پر

مجتبیٰ حسین

کیا پوچھتا ہے دوست یہ کیا لکھ رہا ہوں میں
مٹتے ہوئے خیال کی گل کاریاں ہیں یہ
ہر لحہ سرد ہوتی چلی جا رہی ہے زیست
گذری ہوئی حیات کی چنگاریاں ہیں یہ
پھر کام کرسکے نہ کہیں ذہنِ مضمحل
رنگین حافظے کی فسوں کاریاں ہیں یہ
جو آج لکھ رہا ہوں وہ کل لکھ سکوں گا کیا ؟
مستقبل حیات سے بیزاریاں ہیں یہ
نام و نمود کو نہیں کچھ اس میں اتنا دخل
بس خاطر ملول کی دلداریاں ہیں یہ
کچھ اور ہوسکا نہ بجز یاس و اضطراب
شوقِ شکستہ حال کی بیکاریاں ہیں یہ
کچھ سوچ ہی سکوں گا نہ لکھ ہی سکوں گا جب
اس بے بسی کے دور کی تیاریاں ہیں یہ
اے دوست زندگی نہیں اک مشغلہ ہے یہ
اعصابی اضطراب کا اک سلسلہ ہے یہ
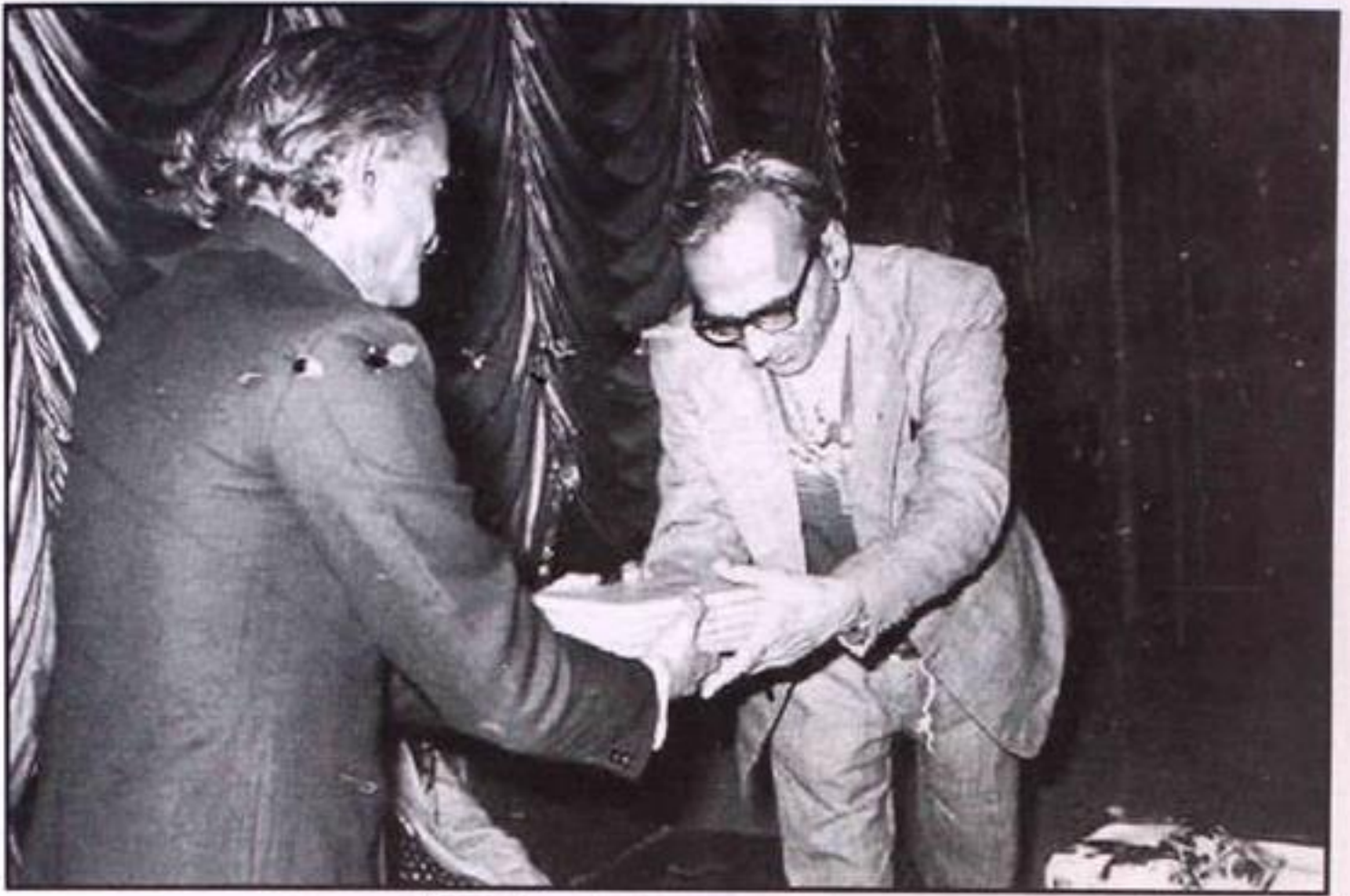
ڈاکٹر محمد حسن سابق صدر جواہر لال یونیورسٹی دہلی، پروفیسر مجتبیٰ حسین صدر شعبہ اردو
بلوچستان یونیورسٹی کو ہندوستانی ادیبوں کی تخلیقات پیش کر رہے ہیں

مجتبیٰ حسین چینی ایمبیسی میں بطور مدیر

پروفیسر مجتبیٰ حسین انتقال سے ایک دن قبل

کوثر جمال مجتبیٰ حسین و بیگم مجتبیٰ حسین کوئٹہ' کوثر جمال کو مجتبیٰ حسین نے چینی ادب پر پی ایچ ڈی کرایا تھا

مجتبیٰ حسین و بیگم مجتبیٰ حسین
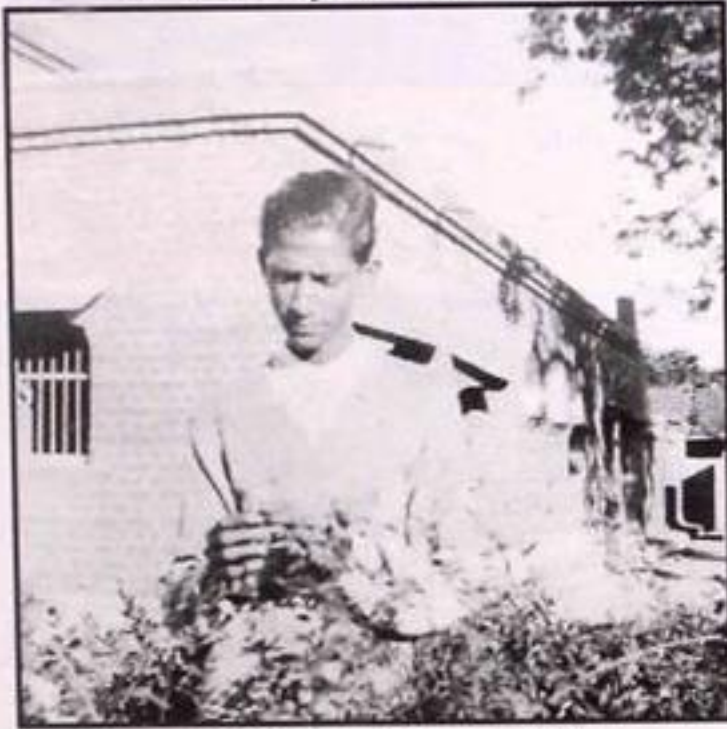
مجتبیٰ حسین کی نوجوانی کی تصویر

جوش ملیح آبادی مشاعرے میں اپنا کلام پیش کر رہے ہیں' پروفیسر مجتبیٰ حسین بھی نمایاں ہیں

پروفیسر مجتبیٰ حسین و بیگم مجتبیٰ حسین نرجس خاتون

مجتبیٰ حسین، عزیز حامد مدنی اور ایک دوست

نیشنل کالج کی ایک یادگار تصویر، مجتبیٰ حسین اور یحییٰ سلام اللہ طلبا و طالبات کے ساتھ
اساتذہ کرام بیٹھے نظر آ رہے ہیں، پروفیسر فراق اور پروفیسر اعجاز احمد نمایاں ہیں

ناتا (جعفر حسین)، عباس باقر،
انیس باقر، اقبال باقر،
غالب باقر اور
دادی (قمر النساء بی بی)
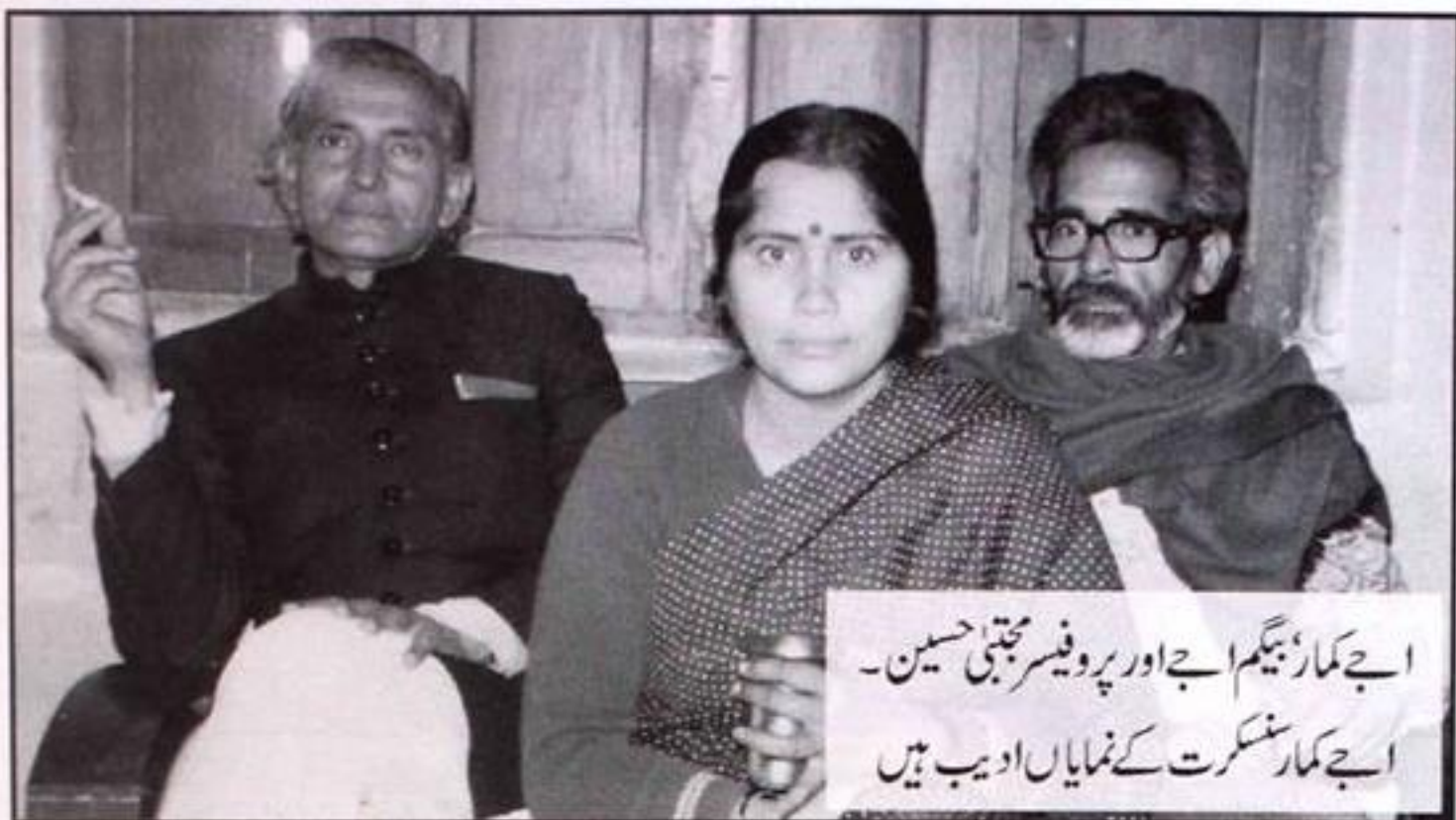
اجے کمار، بیگم اجے اور پروفیسر مجتبیٰ حسین۔
اجے کمار سنسکرت کے نمایاں ادیب ہیں

مجتبیٰ حسین الہ آباد یونیورسٹی میں الوداعی
تقریب سے خطاب کر رہے ہیں
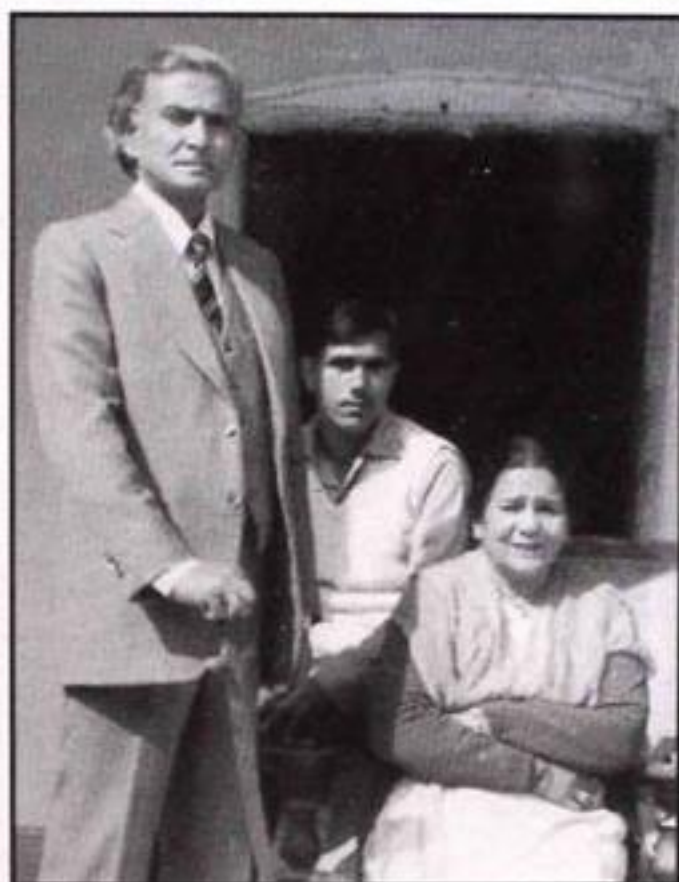
مجتبیٰ حسین و بیگم، ہندوستان میں اپنی آبائی تلوار کے ساتھ

جوش ملیح آبادی اپنا
کلام پیش کر رہے
ہیں، مجتبیٰ حسین
نمایاں ہیں

پھر چلی تیز ہَوا

مجتبیٰ حسین

پھر چلی تیز ہوا
پھر بڑے زور سے گرجا بادل
پھر وہی بارش کی جھڑی
آئینہ دھندلا ہوا جاتا ہے
ان کو آواز دیئے جاتا ہے
"آؤ۔ نکلو۔ یہ حسیں شام بلاتی ہے ہمیں"
پھر چلی تیز ہوا
جیسے اسکرٹ میں ہے رقص کناں
روشنی کمرے کی دیواروں پر
کوئی آواز دیئے جاتا ہے
"آؤ نکلو۔ یہ حسیں شام بلاتی ہے ہمیں"
میں کہاں جاؤں؟
مری زلف کی پگڈنڈی بلاتی ہے مجھے
اب مری راہ یہی ہے۔ مری منزل بھی یہی
اور اس راہ میں اب کوئی نہیں ساتھ مرے
شام بھیگی ہوئی خاموش کھڑی ہے در پر......!

☆

قائداعظم

مجتبیٰ حسین

"موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے"
پھر بھی دل کو نہیں ہے صبر و قرار — لب پہ آہیں ہیں، اشک جاری ہے
زندگی کھوگئی خلاؤں میں — سربلندی نہ خاکساری ہے
ولولے سرد، حوصلے مجروح — سینہ زخمی ہے، ضرب کاری ہے
کوئی عزت نہ کوئی حشمت ہے — کوئی ذلت نہ کوئی خواری ہے
کوئی منزل نہ کوئی راہی ہے — کوئی رہبر نہ "راہ داری" ہے
اب نہ سود و زیاں نہ عقل و جنوں — بس رگوں میں جمود ساری ہے
بام و در ہوں کہ کوچہ و بازار — سب ہیں سنسان سوگ طاری ہے
شمع خاموش، انجمن بے ہوش — تارے بے نور، رات بھاری ہے
نالے لبُ تک بھی اب نہیں آتے — بے قراری سی بے قراری ہے

دفترِ ہست و بود ہے برہم
اُٹھ گیا آج قائد اعظم

لذتِ ہوش و بے خودی نہ رہی — ناز تھا جس پہ، زندگی نہ رہی
زخم کچھ بھر چلا تھا غربت کا — اٹھ گیا دوست دلدہی نہ رہی
جس کی بیگانگی پہ شیدا تھے — آہ وہ رسمِ دوستی نہ رہی
وہ مجاہد، وہ سرفروش کہاں — سطوتِ عزمِ آہنی نہ رہی
ایک روحِ عظیم و جسمِ نحیف — عظمتِ ذکرِ آدمی نہ رہی
وہ حقیقت شناسیاں نہ رہیں — راہ و منزل کی آگہی نہ رہی
وہ جوانی کے ولولے نہ رہے — وہ بڑھاپے کی پختگی نہ رہی
وہ بصیرت وہ فکر تابندہ — عقل کی بزم چاندنی نہ رہی

انجمن ترقی پسند مصنفین سے

سحر کا گیت ہواؤں کی بانسری تو ہے
عذارِ گل پہ صباحت کی روشنی تو ہے

مہ و نجوم مبارک فلک نشینوں کو
غریب خانوں میں چھٹکی جو چاندنی، تو ہے

تری زباں نہیں آلودہ مدحِ سلطاں سے
بشر کی عظمتِ بیدار کی خودی تو ہے

تلاش جس کی تھی مدّت سے علم و عرفاں کو
یقین و عزم کی وہ تازہ زندگی تو ہے

مٹا کے رکھ ہی دیا اعتبارِ فکر و عمل
مزاجِ عالم نو کی وہ پختگی تو ہے

جبین مرد جفاکش پہ جو مچلتی ہے
ادب کے تیرہ افق پر وہ روشنی تو ہے

تمام جذبِ محبت، تمام ذوقِ عمل
دل و دماغ کی اک طرفہ آگہی تو ہے

خدا رکھے تجھے، تیرے جری ادیبوں کو
زبانِ حق ہے امیدوں کی نغمگی تو ہے

☆

پگڈنڈی

شام بھیگی ہوئی خاموش کھڑی ہے در پر
اور بارش ابھی ٹھہری ہے، بہت دیر کے بعد
موٹے بادل کی تہوں کو لے کر
آسماں نیچے اترتا ہی چلا آتا
ایک مرطوب سے بوجھل سے سیہ کمبل میں
ہر شجر لپٹا چلا جاتا ہے
پورچ جلتی ہوئی یادوں کے اندھیروں سے گھٹا جاتا ہے
میرا آئینہ مجھے دیکھ رہا ہے کب سے!
یہ آئینہ...... مرے گیسوو رخسار کی چاہت میں جو دیوانہ رہا
اجنبی بن کے مجھے دیکھ رہا ہے کب سے!؟
یک بیک آج نموار ہوئی
میرے بالوں میں سفیدی کی لکیر
اجنبی بن کے اُسے دیکھ رہا ہے کب سے
میرا آئینہ مرے گیسوو رخسار کی چاہت میں جو دیوانہ رہا
پھر چلی تیز ہوا
پھر بڑے زور سے بادل گرجا

....

....

شام بھیگی ہوئی خاموش کھڑی ہے در پر......!

موت

ساز گھبرا کے اٹھایا تھا کہ دم توڑ چکیں
میں تمھیں آخری جھنکار سنا بھی نہ سکا
اب بھی روئی ہوئی رہتی ہیں یہ آنکھیں میری
میں تمھیں آخری آنسو جو دکھا بھی نہ سکا
ہے غلط عشق ہے سرچشمۂ جوئے ہستی
تم یونہی سوتی رہیں اور جگا بھی نہ سکا
تم نے لکھا تھا کہ ”شادی کی بتایا بھی نہیں“
آہ وہ زخم جسے تم کو دکھا بھی نہ سکا
ہائے وہ آرزوئے الفت پنہاں میری
چاہا تھا اپنا بنانا پہ بنا بھی نہ سکا

☆

کون

یہ صدا اُف یہ صدا دیوانہ ہو جاؤں گا میں
رات کی تاریکیوں میں سسکیاں بھرتا ہے کون؟
سہمی سہمی سی ہے جنبش تیرگی کی گود میں
سامنے آنے سے آخر آج یوں ڈرتا ہے کون؟
سر پھٹا جاتا ہے میرا دور ہو اے تیرگی
اور یہ بھاری قدم احساس پر دھرتا ہے کون؟

☆

ایک شام

بہت اُداس ہے یہ شام زندگی کی طرح
غموں کے سائے بڑھ آئے ہیں تیرگی کی طرح

ہوائیں کھوئی ہوئی چل رہی ہیں کھیتوں میں
مجھے بھی لے کے چلیں موجِ بیخودی کی طرح

دل حزیں ترے بجھنے کا وقت آ پہنچا
دھندلکا گاؤں پہ چھایا ہے بے حسی کی طرح

سنے تو جاتا ہوں ، لیکن سمجھ نہیں سکتا
صدائیں کس کی یہ آتی ہیں خاموشی کی طرح

حیات کا کوئی مفہوم ہی نظر میں نہیں
اگر ہے کچھ تو اک احساس بے دلی کی طرح

چلیں کہاں کوئی منزل نہ کوئی ساتھی ہے
فلک پہ گل ہیں ستارے بھی روشنی کی طرح

کسی کی طرح نہ جب ہو سکے تو کیا شکوہ!؟
نہیں ہے فکر جو ہو جائیں اب کسی کی طرح

☆

مرثیہ

(اقتباس)

ہاں وہ حسینؑ روحِ دوعالم ہے جس کی ذات ہاں وہ حسینؑ زیست کی محرم ہے جس کی ذات

ہاں وہ حسین اشرفِ آدم ہے جس کی ذات ہاں وہ حسینؑ راحت پیہم ہے جس کی ذات

جس نے حیات و موت کو یکساں بنادیا

دل کو دیا وہ درد کہ انساں بنادیا

جس نے جہاں میں حق کو زبردست کردیا جس نے غرورِ ظلم کا سر پست کردیا

جس کی صدا نے عقل کو سرمست کردیا شرحِ مقامِ جبر سرِدست کردیا

جس نے دلوں میں بھر دیئے آزادیوں کے راگ

جس نے رگوں میں پھونک دی قربانیوں کی آگ

جس کی نگہہ نے، فاش کیا زندگی کا راز جس نے دیا دلوں کو تب و تاب و سوز و ساز

جس نے بنایا روح کو باکیف و پاکباز کرتا ہے جس کی ذات پہ پروردگار ناز

شاہی کو جس کی تیغ نے پھینکا ہے چاٹ کر

جس نے پہاڑ رکھ دیئے اک دن میں کاٹ کر

وہ روشنی سی پھیلتی جاتی ہے ہر طرف اک چیز اپنا جلوہ دکھاتی ہے ہر طرف

تابندگی کا راز بتاتی ہے ہر طرف رہ رہ کے اک صدا سی وہ آتی ہے ہر طرف

قربانیٔ حسینؑ کا یہ جلوہ زار ہے

یہ نام وہ ہے جس سے جہاں برقرار ہے

☆

مجتبیٰ حسین

کچھ فیض کے بارے میں
اور بہت کچھ اپنے بارے میں

۱۹۵۲ء میں ایک طویل مضمون میں جس میں مختلف شعراء اور ادباء سے بحث کی گئی تھی میں نے فیض کی شاعری سے بھی بحث کی تھی جس کے نہایت مختصر اقتباسات یہ ہیں:

''ہماری جدید شاعری میں فیض کی آواز بالکل نئی تھی اور اس آواز سے اردو شاعری پہلی بار مغربی شاعری کی غنائیت (Layriciom) سے آشنا ہوئی۔ یوں تو مغربی ادب کے اثرات اردو شاعری فیض سے بہت پہلے ہی قبول کر چکی تھی مگر اردو شاعری پر تمام مغربی اثرات اور ہیئتی تجربات کے باوجود اس کا کلاسیکی مزاج غالب تھا۔ فیض کی شاعری ان تمام روایات تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں سے ہٹی ہوئی تھی جو ہماری شاعری میں نئی معنویت یا قدیم مناسبتوں کے ساتھ مستعمل تھیں۔ فیض کے لہجے کی نغمگی اور خوابناکی اردو فارسی شاعری کی نغمگی سے مختلف تھی۔''

اس کے بعد میں نے کوشش کی تھی کہ فیض کے لہجے میں جو پراسراریت، ماورائیت اور خوابناکی کی تھیں ہیں ان کی توضیح کے لئے فارسی اور اردو کے ایسے اشعار پیش کروں جو موضوع کے لحاظ سے تو ضرور پراسراریت اور ماورائیت رکھتے ہیں مگر اپنے اظہار میں کوئی ابہام نہیں رکھتے' میں نے لکھا تھا۔
''ہماری شاعری موضوع سے براہ راست (Direct) گفتگو کرتی رہی ہے' اس کے بعد فیض کے لہجے کی توضیح میں لکھا تھا۔'' اس میں وہ خوابناکی، وہی نغمگی، وہی رمزیت جو ہمیں Eliot,yeats اور دوسرے مغربی شعراء کے یہاں ملتی ہے یہ لہجہ فارسی اور اردو شاعری کا نہیں رہا ہے۔ ہندوستان میں ٹیگور کے یہاں البتہ مل جاتا ہے۔

اس کے بعد میں ایلیٹ، ییٹس اور دوسرے مغربی شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کر کے فیض کے لہجے کی اس خصوصیت کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اس کے بعد فیض کی شاعری کی ایک اور خصوصیت کو سمجھاتے ہوئے لکھا تھا۔

''ان کی شاعری میں موضوع سے زیادہ فضا اہم ہے جو موضوع کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے فیض کے یہاں ایک رچا ہوا اور حسین تصوّر لیا ہے۔ ان کے لہجے کی جذباتی کشمکش ہمارے سامنے مختلف ذہنی تصویریں پیش کرتی جاتی ہے:

چاندنی راتوں کا بیکار دہکتا ہوا درد

ایک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں — دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں

شدّت تاثر سے جو ذہنی تصویریں Images پیدا ہوتی ہیں جدید ترین آواز لے کر آئے تھے اس آواز کو ہماری شاعری کی روایتوں نے اتنا نہیں ابھارا تھا جتنا سماجی پیچیدگیوں اور مغربی ادب کے رچے ہوئے تاثرات نے۔ نئی شاعری میں اس نئے پن کی بنا راشد نہیں فیض کے ہاتھوں پڑی۔ راشد نے روایات سے صرف ہیئتی اور تکنیکی انحراف کیا ہے مغرب سے انہوں نے اتنا ہی حاصل کیا تھا اور اس ڈھانچہ پر انہوں نے بھاری بھرکم الفاظ کو منڈھنا شروع کیا۔ ذہنی تصویروں کے معاملے میں بھی انہوں نے مغربی ادب کی پیروی کی ہے مگر یہ پیروی بھونڈی اور ناکام ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کی ذہنی تصویریں جذبات میں ڈھلنے کے بجائے خیال بندی سے مل گئی ہیں......''

آگے چل کر لکھا تھا ''ایک طرف مجاز کی شاعری ہے جہاں روایتی تسلسل اور ارتقائے مناسبات اور متعلقات کے ساتھ حسین اور زندہ انداز میں ملتا ہے۔ دوسری طرف فیض کی شاعری ہے جس نے راشد کے برعکس اپنے جدید ترین ہونے کا کوئی اعلان نہیں کیا ہے......فیض کی شاعری میں ارمانوں اور خوابوں کا خون ملتا ہے۔ یہ شکست کا حسین ترین گیت ہے لیکن اس شکست میں قنوطیت اور فرار نہیں ہے۔ اس میں انسانی تاریخ کا المیہ پوشیدہ ہے۔ تاریخی قوتوں کے ادراک اور دکھ درد کے کٹ جانے کے احساس نے اسے نحس اور بیمار (Mobid) نہیں ہونے دیا ہے...... پھر بھی ان کی شاعری آگے بڑھ کے اپنی شدید داخلیت کی وجہ سے زمانے کے سنگین مطالبات کو پورا نہیں کر سکی۔...... اس شبستان میں میلے کچیلے لوگوں کا گذر مشکل ہی سے ہو پاتا ہے......۔

۱۹۶۵ء۔ نقش فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دست تہ سنگ، اتنے مجموعے فیض کے اب تک چھپ چکے ہیں، اب میں دوبارہ سوچتا ہوں کہ فیض کے بارے میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اس میں کچھ ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اپنی تحریروں کو دوبارہ پڑھنے اور جھک مارنے میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ پھر ان کے اقتباسات دنیا سے بھی زیادہ ''کارِ فضول'' ہے بالخصوص قاری کے لئے۔ مگر مجھے فیض پر لکھنا ہے ''افکار'' فیض کا مخصوص نمبر نکال رہا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں پر ان کی زندگی ہی میں مخصوص نمبر نکالنا یقیناً صحت مندانہ روایت ہے اور ان کی تخلیقات کی اہمیت کے اعتراف کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے مگر میرا اس طرح مضمون لکھنا اور دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، یقیناً صحت مند روایت کے حق میں مضر ہے اس کے علاوہ طرحی غزلوں کی طرح یہ مخصوص نمبر طرحی مضامین کے گلدستے بنتے جارہے ہیں۔ طرحی غزلوں کے قوافی طبع آزمائی کے لئے میدان فراہم کردیتے تھے مختلف قافیے مختلف شعراء کے یہاں اچھے بندھتے تھے بعض قافیوں پر تمام شعراء مشترکہ طور پر زور لگاتے تھے۔ اور فیصلہ سامعین پر چھوڑ دیا جاتا تھا کہ کس نے اس قافیہ کو اچھا باندھا بعض قافیہ چھوٹ بھی جاتے تھے۔

فیض پر نقاش فریادی اور دست تہ سنگ کی درمیانی مدت میں جو خاصی طویل ہے متعدد مضامین لکھے جاچکے ہیں اور بعض مضامین بہت اچھے ہیں جن میں فیض کی شاعری کا تقریباً ہر پہلو سے جائزہ لیا جاچکا ہے نفسِ موضوع کے لحاظ سے ہم قافیہ مضامین کی ترتیب کچھ یوں دی جاسکتی ہے۔

۱۔ ۱۹۳۶ء کے بعد کے نئے شعراء میں فیض کا کلام

۲۔ فیض کا سماجی شعور اور ان کی شاعری کا لہجہ

۳۔ فیض کی رومانیت

۳۔ فیض کی امیجری

۴۔ فیض کی غزلیں

۵۔ نئی نسل اور فیض

ادھر کچھ ایسے مضامین بھی لکھے گئے ہیں جو فیض کی نظموں کے تکنیکی تجزیئے سے متعلق ہیں۔ یہ نئے انداز کی تقریباً ویسی ہی کوشش ہے جو ہمارے بزرگوں کے یہاں اشعار کی تعریف وتوصیف میں مل جاتی تھی۔ قوافی اور ردیف کے رشتوں، الفاظ کی مناسبت، تشبیہوں، استعاروں اور صنعتوں کے استعمال کے

سلسلے میں قدیم ناقدین نے جن کاوشوں سے کام لیا ہے اسی سے ملتی جلتی کوشش بھی ہے ایک طرح کا فنی جائزہ یہ بھی ہے۔ ایک امیج بڑھ کر کس طرح دوسری امیج پر ڈھل جاتی ہے۔ ایک دلچسپ تکنیکی تجزیہ ہے اور یہ شاعر کے لئے شاید ایک دلچسپ تجربہ' فیض کی نظموں کا جائزہ اس نوعیت سے بھی لیا جا چکا ہے ایک موضوع اور رہ جاتا ہے۔ وہ فیض کی بین الاقوامی شہرت ہے ممکن ہے اس پر بھی لکھا جا چکا ہو' مگر میری نظر سے نہیں گزرا مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ اتنے بہت سے مضامین کے ہوتے ہوئے جو فیض کے تقریباً تمام پہلوؤں سے بحث کر چکے ہیں ان پر مضمون لکھنے کی کتنی گنجائش رہ جاتی ہے کون کون سے ''قافیے'' نہیں باندھے گئے' یا وہ کون سے قوافی ہیں جو بہتر طور پر باندھے جا سکتے ہیں۔ یا خود میں نے جو مضمون لکھا ہے اس میں ابھی کون سا قافیہ رہ گیا ہے۔ فیض کی شاعری کا وہ کون سا پہلو تلاش کیا جائے جس پر اب تک کچھ نہیں لکھا گیا' یا کم لکھا گیا ہے۔ لکھنے کا یہ عمل بڑا مصنوعی ہے مگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سوچنے کا عمل بھی مصنوعی ہو جاتا ہے۔ لکھنا بہر صورت ایک صنعت ہے خواہ نظم میں ہو یا نثر میں مگر یہ بات کچھ دل کو لگتی نہیں اور اب میں چند سوالات خود اپنے آپ سے کرتا ہوں پہلا وہی سوال ہے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔

۱۔ آیا جو کچھ میں فیض پر لکھ چکا ہوں اس میں کچھ ترمیم کرنا چاہوں گا۔ غالباً نہیں

۲۔ فیض اپنے جدید لب ولہجہ' امیجری اور معنویت کے جذباتی ابہام کے باوصف بڑے مقبول شاعر ہیں' وہ ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں طبقوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ ان کی شاعری کا حسن ہے یا نقص؟

بہت زیادہ مقبول شاعر سے بعض ناقدین کو بدگمانی ہو جاتی ہے جگر بہت مقبول شاعر تھے' ان کی وارفتگی' ان کا ترنم اور ان کی شاعری کا نوجوان مزاج ان کی مقبولیت کا سبب تھا۔ مگر اب ان کی شاعری زرد پڑتی جا رہی ہے۔

ساحر لدھیانوی بھی بہت بڑے مقبول شاعر ہیں۔ سنا گیا ہے کہ ''تلخیاں'' کئی ہزار ایڈیشن تک پہنچ گئی ہے اس کی مقبولیت کا راز بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ساحر کا لہجہ فیض کے لہجہ سے متاثر ہے اور زیادہ شخصی جرأت لئے ہوئے ہے' نابالغ ذہنوں کے لئے ایک دلکشی رکھتا ہے اس کے علاوہ فلم کے گیتوں نے بھی اس کو چمکایا ہے۔

مگر فیض کی شاعری اس نوع کی شاعری نہیں ہے بعض نظموں میں یقیناً عنفوان شباب کی تصوریت اور عشق ناتجربہ کار کی ابہام پسندی ملتی ہے مگر بالعموم ان کا لہجہ اتنا آسان نہیں ہے کہ فوراً مقبول ہو جائے ان کے لہجے میں بڑی بات یہ ہے کہ اس کی لے جس میں کسک' خواب اور اندھیرا ملا ہوا ہے نقش فریادی سے لے کر "دستِ تہ سنگ" تک اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے اس میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے بعض دفعہ البتہ فیض نے کوشش کی ہے کہ اس لہجہ کو بدل کر اس میں ذرا کڑا پن پیدا کریں' کتنے شورش بربط و نے' میں اس بات کی کوشش ملتی ہے مگر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظمیں اپنے مزاج' آہنگ اور یہاں تک کہ فکری ڈھانچے کے لحاظ سے فیض کی نظمیں ہوتے ہوئے بھی دوسرے شاعروں کی کچھ نقالی بن گئی ہیں۔ فیض کے مزاج میں تلخی' تندی اور طنز کی کوئی گنجائش بظاہر نظر نہیں آتی۔ اسی لئے ع: جب کوئی تو ند کا بڑھتا ہوا سیلاب لیے" یا۔ ہاتھ میں تیتری کہسار پہ یلغار کرے۔ قسم کے مصرعے مضحکہ خیز ہو کر رہ جاتے ہیں اور اپنی مجوزہ تلخی یا تندی کھو بیٹھتے ہیں۔

خیریت گذری کہ فیض نے اس قسم کے تجربات بہت کم کیے ہیں۔ ادھر البتہ انہوں نے امیجری کی تعمیر کے سلسلے میں کچھ تجربات کیے ہیں ان کی نظم منظر، رہگذر' سائے' شجر منزل دور' حلقہ بام۔ علائم نگاری کے سہارے ایک نئے تجربے کی خواہش معلوم ہوتی ہے مگر یہ تجربہ بھی ہوا انہوں نے بہت ڈرتے ڈرتے اور اپنے لہجے کے دھیمے پن میں سموتے ہوئے کیا ہے۔ ممکن ہے وہ اس طرح جدید دور کے جدید تر ادبی تقاضوں سے اپنی نظموں کو ربط دینا چاہتے ہوں اور اپنے لہجہ سے ان کا عشق کچھ کمزور پڑ چلا ہو' یا وہ اس لہجہ کو جو بڑا نرم و نازک ہے اس انتہائی تیز رفتار دور میں "زنجیر فکر" سمجھ بیٹھے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ بڑا سانحہ ہو گا فیض کا سارا سرمایہ فیض کا لہجہ ہے اس لہجہ کی شدید داخلیت بعض اوقات اکتا دینے والی ہو سکتی ہے مگر یہ تمام باتیں اس لہجہ سے دستبردار ہونے کا جواز تب ہی بن سکتی ہیں جب فیض اپنی شاعری سے دستبردار ہونا چاہیں۔ علائم نگاری کے تجربات ان کے لہجہ کو زیادہ وسیع اور متنوع شاید نہ کر پائیں بلکہ اس کا اندیشہ ہے کہ ان کی شاعری میں ملاوٹ پیدا ہو جائے۔ بہر حال بات ان کے لہجے کی ہو رہی تھی۔ یہ لہجہ ایسی ایمائیت لیے ہوئے کہ شائستہ مزاجی کے بغیر اس سے لطف اندوز نہیں لیا جا سکتا ہے پھر ان کی شاعری اتنی مقبول کیوں ہے؟ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اپنے کو یا چند آدمیوں کو شائستہ مزاج اور دوسرے تمام لوگوں کو غیر شائستہ سمجھ لینا۔ شائستہ ہونے کی کوئی ایسی قوی دلیل نہیں ہے اور نہ مقبولیت کی بنا پر کسی شاعر سے بلاوجہ

بدگمان ہونے کی ضرورت ہے اگر نک چڑھے ناقدوں کی یہ بات ہم مان لیں کہ ادیب وشاعر کی مقبولیت ان کی تخلیقات کے ناقص اور سطحی ہونے کا ثبوت ہے تو پھر یہ بات بھی مان لینی چاہیئے کہ غیر مقبولیت ہی شاعر اور ادیب کے بلند ہونے کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس سے بعض ناقدوں ادیبوں اور شاعروں اور ادب کے پڑھنے والوں کے لیے شاید کوئی تسکین کا پہلو نکل سکے لیکن اچھا ادب چند مخصوص آدمیوں کی پسند کے تنگ دائرے میں محدود ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کا کام حدیں قائم کرنا نہیں حدوں کو توڑنا ہے اسی لئے وہ صدیوں کو طے کرتا ہوا بے شمار پڑھنے والوں تک پہنچتا رہتا ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ شاعری کے بلند ترین معیار کو قائم کرتا ہے مگر اس کے پسند کرنے والے اور وظیفے کے طور پر پڑھنے والے کچھ کم لوگ نہیں رہے ہیں۔ فیض کی شاعری اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ شاعر کے اپنے تجربات کے لحاظ سے بھی محدود ہے اور لہجہ کے امکانات کے لحاظ سے بھی لیکن فیض کی شاعری نے ایک کام ضرور انجام دیا ہے۔ اس نے درمیانی طبقہ کی المنا کی کو خواب کی مٹھاس دے دی ہے اور یہ طبقہ (ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کراچی کا سب سے فیشن ایبل ہوٹل) میں پہنچ جانے کے باوجود متوسط طبقہ کی خوبو سے دامن نہیں چھڑا سکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس شاعری کو مقبول بنانے میں شاعر کی ذاتی زندگی کا گلیمر بھی ایک حد تک شامل ہے یہ گلیمر ان کے لیفٹننٹ کرنل بننے میں بھی تھا اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے میں بھی اور لینن انعام حاصل کرنے میں بھی مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے فیض اچھے شاعر ہیں اور اچھی شاعری اتنی مدت تک مقبول رہتی ہے تو اس میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دور میں جب نئے شاعر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی دھن میں اپنی انفرادیت اور شعریت کھو بیٹھے ہیں تو فیض کی شاعری کا بدستو مقبول عام رہنا لوگوں کی خوش مزاقی کی دلیل ہے یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ فیض کی نظموں کی فضا اپنے ابہام میں سب کو شریک کر سکتی ہے۔ یہ توضیحی شاعری نہیں ہے اور آخری بات یہ ہے کہ یہ بڑی بے ضرر شاعری ہے وہ کسی کا دل دکھانے کی قائل نہیں ہے۔

۳۔ کیا فیض کی شاعری اتنی پہلودار اور متنوع ہے کہ میرؔ غالبؔ، نظیرؔ انیسؔ، اقبال اور جوشؔ کی طرح کبھی اس کے مختلف پہلوؤں پر کچھ بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

غالباً ایسا نہیں ہے لیکن اس سے فیض کی شاعری کی اہمیت یا قدر کم نہیں ہوتی۔ فیض کی شاعری غم کی شاعری ہے۔ یہ سیاسی غم یا عشقیہ غم۔ فیض کے یہاں ہر چیز غم بن جاتی ہے۔ یہ غم تاریخی مطالعہ کا نتیجہ

ہو یا معاشرتی ناانصافی کا نتیجہ ہو مابعد الطبیعیاتی طور پر تقدیر آدم بن کر آیا ہو ان کی شاعری میں نیند بن کر سرایت کر گیا ہے اور فیض نے اسے اپنے لہجے کی استقامت سے خوشگوار بنا دیا ہے یہ ایک محبوبہ کے تصور کی طرح ان کے نرم رو مصرعوں سے دھیرے دھیرے ابھرتا ہے اور اس زندگی کے دھندلکے میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک غمناک تصور کی شاعری ہے جس میں شاعر کے ذاتی تجربات کا دخل کم ہے وہ اندھیرا جو فیض کی شاعری کے اردگرد پایا جاتا ہے محبوب کی قربت اور دوری دونوں کو یکساں بنا دیتا ہے۔ ان کا لہجہ کئی رنگ کی تصویریں پیش کرنے سے قاصر ہے وہ صرف ایک رنگ کی تصویر پیش کرتا ہے اور وہ ہے سیاہ یا سیاہی مائل رنگ جس میں کہیں کہیں تارے ٹمٹماتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔ 'نقشِ فریادی' سے 'دست تہ سنگ' تک کی منزل تک پہنچنے میں یقیناً فیض ماحول اور عمر کی کئی تبدیلیوں سے گزرے ہوں گے مگر یہ تبدیلی ان کے شعری تجربے کو بنیادی طور پر وسیع کرنے میں کوئی نمایاں حصہ لیتی نظر نہیں آتی ہے۔ ہم تقریباً ایک ہی فضا میں سانس لیتے ہیں اور ایک ہی ساتھپکتا ہوا لہجہ ہمیں دلاسہ دیتا رہتا ہے اور ''شب مست موج کا ساحل'' بدستور دور ہوتا جاتا ہے۔

یوں کہنے کو ہم فیض کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تقسیم سے قبل (نقش فریادی) تقسیم کے بعد (دستِ صبا اور زنداں نامہ) اور فیض کے بیرونی ممالک کے سفر کی شاعری (دست تہ سنگ) لیکن ان تمام ادوار میں جو اجتماعی طور پر بھی بڑے تغیرات کے دور رہے ہیں اور انفرادی طور پر بھی شاعری کی اسیری اور رہائی کے دور بنے ہیں۔ فیض کی شاعری جذباتی دھندلکوں سے باہر نہیں آ سکی۔ ان کے لہجے میں کروٹیں نہیں ہیں۔ میر کی شاعری بھی غم کی شاعری ہے۔ مگر اس غم میں بڑا تنوع، بڑی وسعتیں اور تہذیبی اور کائناتی شعور پایا جاتا ہے۔ میر اپنے لہجے میں کبھی صرف و محض عاشق معلوم ہوتے ہیں، کبھی صوفی، کبھی جوگی، کبھی سماجی ناقد، کبھی ہنسوڑ اور چٹکلے باز۔ ان کا لہجہ غزل، مثنوی، واسوخت، تمام منزلیں طے کرتا ہوا غم کو امرت بناتا جاتا ہے۔ فیض نے بھی بعض اشعار کو واسوخت کا نام دے دیا ہے بعض اشعار کو قوالی بنا دیا ہے بعض غزلوں میں کلاسیکی قطعیت اور صفائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ سب کوششیں ان کے لہجے کو بدل نہیں سکیں اور جہاں ان کا لہجہ بدل گیا ہے وہ فیض کی شاعری نہیں رہی ہے۔ عنوان بدل دینے سے لہجہ نہیں بدل جاتا یہ چیز جہاں فیض کی شاعری کے مضبوط کردار کو ظاہر کرتی ہے وہاں ان کی

شاعری کے محدود ہونے کی بھی غماز ہے۔ ان کی شاعری مدہم لے کی شاعری ہے۔ ذرا لے اونچی ہوئی یہ بے سری ہوئی۔ جہاں تک غالب، اقبال اور جوش کے اسالیب کی بات ہے۔ یہ ہزار سال کو سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فیض کی شاعری اتنی توانا اور وسیع نہیں ہے اور نہ ان کی شاعری سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا مطالعہ اس کی اپنی فضا میں کیا جانا چاہیئے۔ فیض کی شاعری کا سارا حسن اسی فضا سے جھلکتا ہے ان کے یہاں مصرعوں کی معنویت اہم نہیں ہے جتنی وہ فضا جو ان کی نظموں کی اکائی سے ترتیب پاتی ہے اس فضا میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ان کی نظموں میں تنوع کی تلاش بے سود ہے۔ اصل میں اس فضا کو تلاش کرنا چاہیئے جو درد کی طرح بے جہت ہے اور تاریکی کی ہے۔ فیض کے یہاں اتنا تنوع بھی نہیں جتنا ہمیں مجاز کی شاعری میں ملتا ہے مگر مجاز کی شاعری فکر بلوغ تک پہنچنے سے محروم ہوگئی۔ اس کے علاوہ مجاز کی شاعری کے بعض حصے Topical بھی تھے۔ رواروی میں سوچے اور محسوس کئے ہوئے موضوعات میں بہت دنوں تک جان نہیں رہتی۔ فیض کی شاعری Topical نہیں ہے۔ اس میں غم ایک مثبت کردار کی حیثیت رکھتا ہے جو ہنگام کو بھی اپنی غمگین فضا میں ڈھال کر پائیدار بنا دیتا ہے۔ فیض اپنے لہجے اور اپنے لہجے کی تعمیر کردہ فضا سے باہر نہیں آسکتے۔ اسی لیے ان کے سارے تجربات محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان کی شاعری اپنی تمام خوبصورتی کے باوصف ابھی تک پہلودار نہیں ہو پائی ہے۔

ان سوالات کے بعد اب میں سوچتا ہوں کہ فیض کے بارے میں مزید کیا لکھا جاسکتا ہے۔ یا ان کے اور کن پہلوؤں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ غالباً اس کا جواب فیض نمبر میں مل جائے۔ میرے لیے یہ بڑی تقویت کی بات ہوگی اس لیے کہ مجھے کچھ اندیشہ ہے کہ کہیں فیض کی شاعری فضائی یکسانیت کی بنا پر اپنا حسن کھو نہ بیٹھے۔ اور اگر فیض نے فنی تجربات کے ذریعہ اس فضا اور لہجہ میں تبدیلی پیدا کرنی چاہی تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ان کی شاعری تجربات اور محسوسات کے تنوع کی جگہ تکنیک کا تنوع بن جائے اور اس میکانکی انداز کی نذر ہو جائے جس نے راشد کی شاعری کو بے روح بنا رکھا تھا۔

میں سوچتا ہوں کہ میں نے فیض کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے بار بار لہجہ اور فضا کا ذکر کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا فیض کی شاعری میں سب کچھ یہی ہے یا اس کے علاوہ بھی ہے۔ میرے لیے اس کے علاوہ اور شاید کچھ نہیں ہے اور جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب ضمنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان کا سیاسی شعور، ان کی ترقی پسندی، ان کی انسان دوستی سب اسی فضا کو تعمیر کرتی ہیں اور اسی فضا سے ابھرتی بھی ہیں۔ اب میرے

لیے صرف ایک چارۂ کار ہے' میں فیض کی شاعری کی جگہ اپنا جائزہ لوں تو ایسا تو نہیں ہے کہ میں نے اپنی ذہنی کیفیات کو فیض کی شاعری پر مسلط کر دیا ہے۔ عین ممکن ہے۔ مگر اچھی شاعری اپنے پڑھنے والوں کو اس طرح بھی تقویت پہنچاتی ہے...... تو کیا بہتر نہیں ہوگا کہ میں اپنے محسوسات کے ذریعہ اس فضا کا تجزیہ کروں جو فیض کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ اس سے حاصل؟ شاید ذہنی دیانت کے ساتھ از سر نو ان کی شاعری کو اپنے دل میں تازہ کر سکوں۔

بہت پہلے کی بات ہے میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ فیض کی نقش فریادی ابھی چھپی نہیں تھی۔ نیا ادب کا تازہ پرچہ جو ان دنوں لکھنؤ سے چھپتا تھا' مجھے گاؤں میں ملا۔ اس میں فیض کی نظم ''موضوع سخن'' شائع ہوئی تھی:

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام

میں نے پہلی مرتبہ فیض کی نظم پڑھی تو ایک عجیب تاثر میں ڈوب گیا جس کو بیان نہیں کر سکتا۔ گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام۔ میں اس نظم کے پہلے مصرعے کی اس تصویر کو پوری طرح گرفت میں نہیں لے سکتا جو اس مصرعے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر لفظ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر گھل کر جس طرح ایک ذہنی اور جذباتی تاثر پیدا کرتا ہے اس کی باریکیوں تک اس وقت میری نظر نہیں پہنچ سکی مگر میں نے اس میں ایک ایسی کیفیت پائی جو مجھے اس دور کے کسی نئے شاعر میں نہیں ملی۔ اس میں افسردگی تھی' تھکن تھی' تنہائی تھی اور زندگی کے بے سود ہونے کا احساس۔ پھر ان مصرعوں نے مجھے ایک خواب کی دنیا میں پہنچا دیا

جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

یہ بے یقینی کی فضا جس میں قربت اور دوری دونوں کا شدید احساس ہے' دل میں اتر گئی۔ پھر میں نے ان کی اور نظمیں پڑھیں ''تنہائی'' نے مجھے وہ چیز دے دی جسے میں محسوس کرنا چاہتا تھا مگر محسوس نہیں کر پاتا تھا۔ تنہائی میں مجھے ایک اور چیز بھی ملی جسے آدمی۔ یا شاید اس عمر کا آدمی سمجھنا چاہتا ہے مگر سمجھ نہیں پاتا جس کو فرسٹریشن' ناکامی کا پرلذت احساس کہہ لیجئے۔ میں فیض کی نظمیں پڑھتا گیا اور ہر نظم ایک ایسے لہجے سے مجھے پکارتی رہی جس میں بڑی سرگوشی ہوتی ہے' بڑی قربت ہوتی ہے اور بڑا

دکھ ہوتا ہے۔ اور میں ایک ایسی فضا میں پہنچتا گیا جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کی تنہائی، بے یقینی، جانبازی اور بے جہتی بھی کچھ تھا۔ یہ بڑی غمگسار فضا تھی، اس میں آج بھی غمگساری ہے مگر کچھ اس قسم کی:

مرے ضبط حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

آج جب میں فیض کی نظمیں پڑھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض کی ہر نظم مجھے اسی فضا کی یاد دلاتی ہے جس میں مَیں تھا، جو مجھے بہت عزیز تھی مگر اب وہ صرف ایک یاد بن کر رہ گئی ہے اور اسی لحاظ سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے فیض کی ہر تازہ نظم ان کی پرانی نظم کی یاد دلاتی ہے۔ یہ فیض کے کلام کی بڑی خوبی بھی ہے۔ ان کا کلام وحدت میں سوچا جا سکتا ہے۔ الگ الگ کر کے یا ادوار میں تقسیم کر کے شاید اس کا دیکھنا محال ہے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ فیض کے یہاں جو فضا ہے وہ کن عناصر سے مل کر ترتیب پاتی ہے۔ میرا خیال ہے وہ دو رنگوں سے مل کر بنی ہے۔ سیاہ اور سرخ۔

نقشِ فریادی

ان گنت صدیوں کے تاریک، بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گذری ہے
دیکھ آہن گر کی دکاں میں (آہن گر سیاہی کا بدل ہے)
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن

دستِ صبا

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
جواں لہو کی پراسرار شاہراہوں سے (پراسرار اندھیرا لیے ہوئے ہے)

اور اب رات کی سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے (گھاؤ۔ سرخ لہو کا بدل ہے)
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام

جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم (قبا یقینی طور پر تو نہیں لیکن سیاہی کا تصور بھی رکھ سکتی ہے)

زنداں نامہ
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے (خون کی سرخی چھپی ہوئی ہے)

لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں (غمکدہ۔ ظلمت کدہ)

دشمنِ جاں ہیں سبھی سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی

شام گلنار ہوگئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں

دست تہ سنگ
اب کوئی جنگ نہ ہوگی، نہ کبھی رات گئے

خوں کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے

خونِ دلِ وحشی کا صلا کیوں نہیں دیتے

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ بام

....

....

اک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو

خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے

محفلِ درد پھر رنگ پر آ گئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آ گیا

اور ہر کشتۂ واماندگی آخرِ شب

پھر لہو سے ہر ایک کاسہ سر

پر ہوا جامِ ارغواں کی طرح

(داغ اور لہو)

اس شام کا سورج ڈوبے گا

(شفق کی سرخی)

زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ

آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے

یہ اشعار اور مصرعے بڑی رواروی میں منتخب کیے گئے ہیں مگر مشکل ہی سے فیض کی کوئی ایسی نظم یا غزل ہوگی جس میں یہ دو رنگ ساتھ یا الگ الگ نہ ملیں ان دو رنگوں کے درمیان سے کبھی کبھی پھیکی سہمی ہوئی سی روشنی جھانکنے لگتی ہے۔

اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں

اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے

جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے

یہ داغ داغ اُجالا' یہ شب گزیدہ سحر

یہ پھیکی روشنی مختلف پیرائے سے فیض کی شاعری میں ملتی ہے کبھی یہ چاندنی بن کر آتی ہے' کبھی یہ عارضِ محبوب کی صباحت بن کر آتی ہے کبھی سایوں سے گفتگو کرتی نظر آتی ہے۔ کبھی رات کا پچھلا پہر بن جاتی ہے اور کبھی امید کی ہلکی سی کرن۔ لیکن فیض کے یہاں مرکز سیاہی اور سرخی کا ہے۔ اس میں سیاہی کا حصہ غالب ہے۔ یہ دو رنگ فیض کے یہاں مختلف علامتوں کا مظہر بن جاتے ہیں ان میں تاریخ کا ظلم اور جبر' جوانی کی سیہ مستی اور جوانی کی ناکامی۔ گھنی زُلفوں کی پراسرار چھاؤں' حنا کی سرخی' چہروں کا حسن۔ پراسرار اندھیرے کی تہ بہ تہ خاموشی' خراب اور شکست خواب سب کچھ ہے' فیض بالعموم انہیں دو علامتوں کے دائرے میں سوچتے ہیں۔ جادو کے ان دائروں سے باہر ان کی شاعری قدم دھرتے ہوئے ڈرتی ہے' اسے رات سے پیار ہے حالانکہ وہ رات سے خائف بھی ہے۔

فیض کے لہجہ کی خوابنا کی' رمزیت' آہستہ روی سب اسی لہجے سے بنی ہے' اب ایک اور پریشان کن سوال میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ کیا اندھیرا بھی شاعری کے لئے فیضان (Inspiration) بن سکتا ہے۔ گوئٹے نے مرتے مرتے روشنی کو اندھیرا اور اقبال نے لکھا تھا:

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ

مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

جوش کی شاعری میں بقول فراق گورکھپوری "دن نکلا ہوا ہے آدمی سو نہیں سکتا" اور ہمارے ایک غزل گو نے کیا خوب مطلع کہا ہے:

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں — وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

مگر فیض کے یہاں اندھیرا ہے جو زخم بھی ہے اور مرہم بھی۔ اس اندھیرے میں آدمی سائے کی طرح ابھرتے ہیں۔ اُن کی پیشانیاں کچھ دیر کے لئے چمکتی ہیں اور پھر وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتے ہیں "آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے۔ زندگی کے انجان اور بے پایاں اندھیرے سے فیض کی

شاعری کی فضا ترتیب پاتی ہے یہ فضا دل شکن بھی ہے اور دلکش بھی۔ اس میں لوگ زندہ بھی ہوتے ہیں اور قتل بھی کیے جاتے ہیں۔ فیض نے اس فضا کو اپنے دور کی بے رنگی اور بے غایتی سے ربط دے کر ایک جدید معنویت دی ہے فیض کی نظموں کو پڑھتے وقت کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم جیمس کی Cutsider سے گزر رہے ہیں اس میں ہر چیز مربوط بھی ہے اور غیر مربوط بھی۔ جہاں ہر فعل اضطراری بھی ہے اور اختیاری بھی جس کی پھیکی بے معنی روشنی میں آدمی جینے اور مرنے پر مجبور ہے۔

مَیں اگر فیض کی نظموں کی فضا کا تصوّر کروں تو وہ کچھ یوں ہوگا۔ شام کا وقت' لاؤنج میں کرسیاں اور میزیں قاعدے سے لگی ہوئی ہیں جن پر سبز میز پوش ہیں اور نیلے شیڈ کے ٹیبل لیمپ رکھے ہوئے ہیں سبز گوشوں میں نیلگوں سائے۔ شام ڈھل چکی ہے اور چاند اُبھر رہا ہے۔ نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل۔ کرسیوں پر عورتیں اور مرد آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے ہیں سرگوشیوں میں۔ اندر بڑے ہال میں پیانو پر مدہم سروں میں بج رہا ہے۔

مضمحل لے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں

یہ عورتیں اور مرد جو آپس میں گفتگو کر رہے ہیں خواب کے زن و مرد معلوم ہوتے ہیں۔ یہ گفتگو کرتے کرتے چپ ہو جاتے ہیں ان کے سلونے چہروں پر ایک کرب سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یادِ ماضی سے غمگیں' دہشت فردا سے نڈھال۔ فیض کی شاعری اسی فضا میں گھومتی رہتی ہے۔ اس فضا سے باہر نکل کر وہ شاید جی نہیں سکتی۔ تیز روشنی میں اس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی پتھریلی زمین پر گلاب سا چہرہ پسینہ میں تربتر ہو جائے گا اور اس کا پاؤڈر چھوٹ جائے گا اس کے حنائی پیر زخمی ہو جائیں گے۔ زندگی کی کڑی دھوپ میں اس کا حسن کمھلا جائے گا۔

میں جب اس فضا کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہوں تو ماضی اپنے تھکے ہوئے قدموں میرے قریب پہنچ جاتا ہے اور بڑی اپنائیت سے مجھے دیکھنے لگتا ہے ۔ درد کا چاند بجھ گیا' ہجر کی رات ڈھل گئی۔ مجھے اس فضا سے عشق ہو جاتا ہے اور غالباً فیض کو بھی جتنا عشق اس فضا سے ہے اتنا کسی اور سے نہیں۔ فیض نے اس فضا کو جس طرح قائم رکھا ہے' وہ ان کا کارنامہ ہے' ان کی شاعری دوسری جنگ عظیم سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس نے آزادی کی جدوجہد کو دیکھا' دوسری جنگ عظیم دیکھی۔ تقسیم سے گزر کر یہاں تک پہنچی۔

اور اب وہ جوہری توانائی کے دور میں داخل ہو چکی ہے کتنے بڑے تغیرات سے ہم گزر کر یہاں تک آئے ہیں اور کتنے بڑے تغیرات ہمارے سر پر منڈلا رہے ہیں اور زندگی کس قدر عجلت پسند، متلون مزاج اور بے مرّوت ہو چلی ہے۔ لیکن فیض کی شاعری نے اپنے ضبط و وقار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا وہ اس سخت ہیجانی دور میں بھی اپنے کو لیے دیے رہی اور حسن کے خواب دیکھتی رہی۔ یہ بڑی بات ہے۔ فیض کی مربوط شعری شخصیت اس دور میں ہماری جدید شاعری کو سہارے دیتی رہی ہے۔

فیض کی یہ شاعری میرے لیے آج بھی کبھی کبھی دلدہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اسے پڑھ کر یہ احساس قدرے کم ہو جاتا ہے کہ اتنے بڑے شہر میں آدمی تنہا ہے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین

اقبال کی رہائی کب ہوگی؟

ایک سوال اردو ادب اور اقبال دونوں سے گہرا شغف رکھنے والوں کے لبوں تک آ کے رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اقبال کو اقبال دوستوں کی عقیدت مندی، قدردانی، سرپرستی اور حکیمانہ موشگافیوں سے رہائی کب اور کیسے نصیب ہوگی۔ اقبال پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا اور لکھا جا رہا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ یوم اقبال ہر سال ملک بھر میں بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے جس میں شعراء، ادباء اور عام سامعین کے علاوہ افسران بالا بھی شریک ہوتے ہیں۔ یہ خوشی کے ساتھ تقویت کی بات بھی ہے۔ خصوصاً افسران بالا کی شرکت۔ پرانے زمانے میں سخن فہمی عالمِ بالا کی دھوم تھی۔ ہمارے زمانے میں خدا کا شکر ہے افسران بالا کی سخن فہمی کی بدولت ادبی دنیا میں خاصی چہل پہل اور رونق نظر آتی ہے۔

اقبال ان معنوں میں بہت ہی خوش قسمت شاعر ہیں۔ ملک میں کئی ایسے ادارے ہیں جو باقاعدہ نشر و اشاعت کے ذریعے اقبال کے کام اور پیام سے ہمیں روشناس کرا رہے ہیں۔ نو بہ نو مضامین لکھے اور لکھوائے جا رہے ہیں۔ یہ ساری باتیں ظاہر ہے بڑے خلوص اور عقیدت مندی سے ہو رہی ہیں لیکن جب ہم اقبال پر لکھی جانے والی کتابوں اور مضامین پر نظر ڈالتے ہیں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے چند دائرے بنا لئے ہیں اور ہر پھر کر اقبال کو انہیں دائروں میں مقید کرتے رہتے ہیں۔ اقبال اور رومی، اقبال اور نطشے، اقبال اور گوئٹے، اقبال اور برگساں، اقبال اور دانتے، اقبال اور اسلام، اقبال اور اشتراکیت، اقبال اور تصورِ خودی، اقبال اور تصورِ پاکستان، اقبال اور مردِ مومن، اقبال اور عورت، اقبال اور شاہین، اقبال اور نظریہ اضافیت، اقبال اور اقبال، اقبال اور روزگار فقیر، پھر اقبال اور ریڈیو، اقبال اور ٹیلی ویژن، اقبال اور فلم۔ اس کے بعد اقبال اور ملک کے مختلف بڑے ہوٹلوں میں یوم اقبال کی تقاریب، دعوتیں، تقریریں اور فوٹو کھنچوانے کے اہتمام، اخباروں کے خاص نمبر، اقبال کی شاعری کے انگریزی، عربی اور دیگر زبانوں کے تراجم، آخر میں اقبال اور ان کے احباب، اقبال اور فرزندانِ اقبال، غرض اس قسم کے عنوانات کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔ ظاہری بات ہے اقبال کے کلام کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی

ایسی کوششیں برابر ہوتی رہیں گی اور ان کوششوں کی اہمیت اور افادیت سے انکار کی کوئی معقول وجہ ہے بھی نہیں۔

لیکن شاید آپ اس سے اتفاق کریں کہ یہ بہت تنگ دائرے ہیں اور اقبال کا کلام ہر بڑے شاعر کے کلام کی طرح دائروں کو توڑ کر نکل جاتا ہے۔ وہ آزادی کا خواہاں اور جویا ہے۔ اسے گھونٹ کر رکھنا اقبال کے ساتھ کوئی بہت اچھا سلوک نہیں ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

اس طرح اگر ہم دائروں میں سوچتے اور لکھتے گئے تو وہ دن دور نہیں کہ عنوانات کی فہرست مضحکہ خیز صورت اختیار کر لے گی۔ آئندہ چل کر اقبال اور محکمہ موسمیات پر بھی لکھا جا سکتا ہے

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہِ اِضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگ نخیل دھل گئے
ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثل پرنیاں
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا
دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا

یا

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اقبال اور علم نجوم پر بھی اچھا خاصا مضمون لکھا جا سکتا ہے

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

مضمون کے خاتمے پر یہ بھی لکھا جا سکتا ہے کہ آخر عمر میں اقبال کی دلچسپی علم نجوم سے ختم ہو چکی تھی۔ ثبوت کے طور پر یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ آپ وسعتِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

ان تمام باتوں کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اقبال پر نئے نئے عنوانات کے تحت مضامین نہ لکھے جائیں یا ان کی فکر کے نئے گوشوں سے بحث نہ کی جائے۔ ایسا ممکن ہی نہیں لیکن اقبال پر اس نوع کی مضمون نویسی کی مشق میں اندیشہ یہ ہے کہ وہ تمام باتیں جو اقبال میں ہیں ان پر ہماری نظر نہ جائے اور وہ تمام باتیں جو ہم میں ہیں یا ہمارے ذہن میں ہیں ہم انہیں قلم بند کر ڈالیں۔

تنقید نگاروں نے اس سلسلے میں قلم کی بڑی جولانیاں دکھائی ہیں جن کے تذکرے کی یہاں نہ گنجائش ہے۔ اقبال قومی اور ملی شاعر ہیں۔ تسلیم ہے۔ اقبال ترجمانی حقیقت، شاعر مشرق اور حکیم الامت ہیں۔ یہ بھی اقبال نے تصور پاکستان دیا۔ بالکل بجا۔ لیکن ان تمام باتوں کو ماننے کے ساتھ ساتھ اگر یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ اقبال بنیادی طور پر اول و آخر ایک شاعر ہیں تو قباحت کیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ ان لاتعداد مضامین میں مشکل ہی سے چند مضامین ایسے ہوں گے جن میں اقبال کے شاعرانہ مرتبے سے بحث کی گئی ہو۔ آپ ذرا ان کتابی مضامین کے نام اپنے دل میں دہرائیں جن میں اقبال پر اس رخ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مشکل ہی سے کوئی نام آپ کے ذہن میں آئے گا۔ آخر ہم اقبال کو اس طرح اپنے مقاصد کے لئے اب تک استعمال کرتے جائیں گے ان کو شاعر کہنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ اس میں ان کی اہمیت کو کس طرح اور کس نوع کا صدمہ پہنچ سکتا ہے جب غالبؔ پر مضمون یا کتاب لکھتے ہیں تو ہمارے سامنے ان کی شاعرانہ حیثیت ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ کیا میرؔ و غالبؔ لحاظ سے چھوٹے ہو گئے۔ کیا میر کی شاعری میں عشق کی بلند نگہی اور ہمہ گیری نہیں ملتی؟

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

☆

یاد رکھ شورشِ زمانہ ہے
عشق کی ایک بات بھاری ہے

کیا میر کے یہاں عقل و جنوں کے مقامات کا تعین ان کے مخصوص لہجے میں نہیں ملتا ہے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

میر آدمی کی عظمت سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اسی طرح غالبؔ کے یہاں بھی زندگی کا گہرا فلسفیانہ احساس اور تلاش ملتی ہے

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو؟

☆

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

ان تمام شعرا سے ہمارا رشتہ بہر طور ان کی شاعری ہی کی وجہ سے استوار ہے، میر کی سیادت یا غالب کے آبا کی سپہ گری کی وجہ سے ہم ان کا احترام نہیں کرتے۔ ان کی شاعری ہماری تہذیبی سانس بن چکی ہے جس کے عنوان سے ہمارا زندہ رہنا مشکل ہے۔

پھر اقبال کے ساتھ یہ انتہائی غیر شاعرانہ سلوک کیوں ہے؟ ان کا شمار ہمارے صفِ اول میں ہے۔ اس میں سبکی کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔ میر و غالب کی صف میں پہنچ جانا سبکی نہیں اعزاز کا باعث ہے۔

یہ سچ ہے کہ اقبال کی شاعری میر اور غالب کی شاعری سے مختلف ہے۔ اس کی نوعیت، اس کا مقصد اور اس کا عہد مختلف ہے۔ اقبال کے کلام کے فکری عناصر کی تشکیل اور تعمیر مختلف فضا میں ہوئی ہے لیکن اقبال سے ان کی شاعری لے لیجئے اور پھر ان کے فلسفیانہ مضامین کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ نے اقبال اور ان کے فلسفیانہ مضامین دونوں کے ساتھ کتنی بے رحمی کا برتاؤ کیا ہے۔ ان کے شعری محاسن کا ذکر کیے بغیر اقبال اور برگساں اقبال اور نطشے قسم کے مضامین بے روح اور بے بنیاد رہ جائیں گے۔

ممکن ہے اس موقع پر کہا جائے کہ وہ ایک خاص مشن اور پیغام لے کر آئے تھے۔ اقبال کا کلام پڑھنے

والوں کے لئے یہ بات کوئی ایسی نئی نہ ہوگی جس کو سن کر وہ انگشت بدنداں رہ جائیں اور نہ اقبال کی شاعری پر مرمٹنے والوں کے لئے اس میں کوئی حوصلہ شکن پہلو نکلتا ہے۔ کون ایسا بڑا شاعر گزرا ہے جس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیں کوئی پیغام نہ دیا ہو۔ شاعری خود اپنی جگہ ایک پیغام ہے، بہت بڑا پیغام۔ اپنی بلندیوں پر پہنچ کر یہ اتنا ہی اہم پیغام بن جاتی ہے جو ہمیں کسی دینی، عمرانی، معاشی یا سائنسی مفکر سے مل سکتا ہے۔ بعض اہل فکر اس جگہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خود اقبال اپنے کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا نہیں چاہتے تھے

حدیث بادہ و مینا' جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

مگر یہ تمام اشعار ان کے شاعر ہونے کی نفی نہیں کرتے۔ یہ ان کی مسلمہ شاعرانہ حیثیت کی تصدیق اور توثیق ہیں۔ اقبال کے اس قسم کے اشعار جب کوئی ان کو صرف حکیم اور پیغامبر ثابت کرنے کی غرض سے پیش کرتا ہے تو غالباً وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اقبال نے ادب اور زندگی کے قریبی رابطے کو سمجھ کر شاعری کی ہے۔ وہ اہل نظر کے ذوق نظر کے منکر نہیں۔ البتہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ حقیقت نظر انداز نہ کردی جائے۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ اقبال کا تاریخی مطالعہ ان کی تجزیاتی نظر ان کا پختہ ادبی شعور کسی صورت سے ادب برائے ادب کے نظریے کو قبول کر ہی نہیں سکتا تھا۔

دراصل سرسید تحریک نے بہت پہلے ادب کو زندگی سے شعوری طور پر ربط دے دیا تھا۔ ادبی محاذ پر مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس دونوں میں ادب اور زندگی کے اس ربط کو نہ صرف تلاش کیا بلکہ استوار بھی کیا۔ اقبال اس تحریک سے متاثر بھی تھے اور خود ان کے وسیع مطالعے نے انہیں یہ بتا دیا تھا کہ ان کے دور کے شعری تقاضے کچھ اور ہیں۔ وہ شاعری کی ہمہ گیری سے نا آشنا نہیں تھے

شاعر دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

یہ ہماری بڑی جسارت ہے کہ ہم اقبال سے ان کی شاعری چھین لیتے ہیں اور انہیں صرف فلسفے کی کتابیں دے دیتے ہیں۔ یہاں فلسفے اور ادب کے دیرینہ اور گہرے روابط پر بحث کی ضرورت نہیں

معلوم ہوتی ادب کے طالب علم کو ابتداء ہی میں ان مباحث سے گزرنا پڑتا ہے۔ بڑے شاعر کی فکری اساس کسی نہ کسی نظام زندگی یا نظام فکر پر ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں یہ احساس موجود ہے اور ان کی شاعری کی پر شکوہ عمارت اسی اساس پر کھڑی ہے لیکن یہ نہ بھولیے کہ یہ عمارت کسی بینک، سرکاری دفتر یا فیکٹری کی نہیں ہے۔ یہ عمارت صرف شاعری کی ہے اور دو دو مصرعوں سے تعمیر ہوئی ہے۔ مصرعوں میں اقبال کا خون جگر ہے "قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل" اس عمارت میں شاعر کا دل دھڑکتا۔ شاعری جب لفظوں اور مصرعوں سے مسجد قرطبہ از سر نو تعمیر کرتی ہے تو اسے بڑی شاعری اور فکر کی عظمت، تقدس پائیداری دے دیتی ہے

کعبہ ارباب فن سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

اسی نظم کا یہ شعر بھی دیکھئے

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

اس شعر میں یہ بھی دیکھئے کہ داغ کے اس شاگرد نے شاعری کو کہاں پہنچا دیا ہے۔ کتنی پاکیزگی، کتنی بزرگی روحانی فرحت بخش دی ہے۔ ہر اچھی شاعری کا یہی کام ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اقبال کے کلام میں یہ عناصر کیوں تلاش کرتے؟ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کیا ہم شاعری کے اہم رول سے ناواقف اور بے خبر ہیں اسے صرف تفریح اور مشاعرے کی چیز سمجھتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو یہ بڑا تہذیبی المیہ ہے۔ اس کے صرف ایک معنی کہ ہم قوت تخلیق کھو چکے ہیں۔ اس لئے کہ شاعری ماضی کو زندہ کرتی ہے حال کو گوارا بناتی ہے اور مستقبل کو روشن کرنا شاعری آدمیوں اور معاشرے کو جزو نہیں کل کی صورت میں دیکھتی ہے اور اسی لحاظ سے بحث بھی کرتی ہے۔ شاعری کو مبالغہ اور جھوٹ سمجھنے والے یقیناً اب بھی بہت سے حقیقت پسند، دانا، بینا، قوم سدھار حضرات ہیں مگر کیا کیا جائے کہ خود اقبال نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے جس ذریعے کو چنا وہ شاعری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شاعری کسی اور کی شاعری کا نام نہیں۔ یہ فردوسی و نظامی کی بھی شاعری ہو سکتی ہے، حافظ و سعدی کی بھی ہو سکتی ہے، نظیری اور عرفی کی ۔

بھی ہوسکتی ہے، خیام اور ابن یمینی کی بھی ہوسکتی ہے۔ میر، سودا، غالب، انیس، اقبال اور جوش کی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ کسی ایک مزاج، نظریے یا جذبے کی پابند نہیں۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

نالہ پابندِ نے نہیں ہے

لیکن اچھی شاعری خواہ کسی رنگ کی ہو، زندگی ہی پر عاشق ہوتی ہے اور یہ اتنی حقیقت آشنا ہوتی ہے کہ سامنے کی بہت سی حقیقتیں جن کی جانب ہمارا دھیان بھی نہیں جاتا، اس کے قالب میں ڈھل کر پہلی بار اپنے کو عیاں کرتی ہیں۔

اسی لئے شاعری کو کم درجے کی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دینا کوئی بہت مہذب یا عقل مند ہونے کی دلیل نہیں۔ شاعری سے ڈرنا دراصل تہذیب کے حسن سے بھاگنا ہے۔ یہ بڑی بدذوقی ہے اور کوئی قوم بدذوق ہوکر اپنے آپ کو بحسن وخوبی انجام نہیں دے سکتی۔ عدل اور ظلم، خیر اور شر سب کی بنیاد اسی ذوق پر ہے اور ان کے درمیان یا نہ کرنا خوش ذوقی یا بدذوقی کی دلیل ہے۔ آدمی کو زندگی برتنے کا سلیقہ اور شعور عطا کرنا شاعری کی بڑی دین ہے۔

اقبال کی شاعری ہمیں ذوقِ زندگی عطا کرتی ہے۔ انہوں نے دنیا کے تمام بڑے شاعروں کا کلام پڑھا تھا۔ وہ اپنی شعری روایات، شعری تاریخ، شاعری کے حسن وقبح اور اس کے بنیادی تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ برسوں کی ریاضت ان کی شاعری سے نمایاں ہے۔ اپنے عہد کے ممتاز ادب شناسوں سے ان کے قریبی روابط تھے۔ شعر وسخن، یہاں تک کہ زبان کے معاملے میں بھی ان سے برابر مشورہ لیتے تھے۔ فنون لطیفہ کے دوسری شاخوں سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے یہاں بنیادی انسپریشن (Inspiration) شاعر کا ہے۔ کسی دینی مبلغ یا فلسفی کا نہیں۔ ایسی صورت میں حیرت کی بات ہے کہ ہم نے اب تک اقبال کے شاعرانہ اور فنی کمال کی طرف کوئی سنجیدہ توجہ نہیں دی۔ ہمارے قلم پرکار کی طرح گھومتے رہے اور ہم اقبال کو ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں منتقل کرتے رہے۔

مگر جس طرح بعض قیدیوں کو جیل میں نظر بند کر دینے کے باوجود ان کے خیالات کو مقید نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اقبال کو بھی تنگ دائروں میں زیادہ مدت تک اسیر نہیں کیا جاسکتا۔

دیکھنا ہے کہ کون ناقد انہیں رہا کراتا ہے!!

گردشِ رنگ چمن......ایک مطالعہ

پروفیسر مجتبیٰ کا آخری طویل مضمون

HISTORY IS A NIGHTMARE FROM WICH I AM TRYING
TO AWAKE (ULYSSES) JAMES JOYCE.

"تاریخ ایک کابوس ہے جس سے (جاگنے) نکلنے کی میں کوشش کررہا ہوں۔"

(یولیسس) جیمس جوائس

"گردشِ رنگ چمن" قرۃ العین حیدر کا پانچواں ناول ہے۔ ان پانچوں ناولوں میں کچھ چیزیں کم و بیش مشترک ہیں اور ان کی فضا میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔

ایک تو ان کے نام کسی نہ کسی شاعر کے کلام سے لئے گئے ہیں۔ میرے بھی صنم خانے' سفینۂ غم دل' آگ کا دریا' آخر شب کے ہم سفر' گردش رنگ چمن یہ سارے نام مختلف شعراء کی "دین" ہیں۔

دوسرے ان میں کچھ تاریخ ہے کچھ افسانہ۔

تیسرے' کچھ عہد قدیم ہے' کچھ عہد جدید۔

چوتھے' کہانیوں کا دلی' کلکتے' ڈھاکے' لندن میں پھیلے ہونے کے باوجود ان کے مرکزی عمل کا تعلق بالعموم لکھنؤ سے ہے۔

پانچویں' زبان کے اعتبار سے ان میں اردو' ہندی اور انگریزی کبھی پیوست اور کبھی دست و گریباں نظر آتی ہے۔ یہ زبانیں کبھی حالات' مواقع اور کرداروں کی گفتگو کے فطری تقاضے اور ایک اجنبی رومانیت کی حسن آفرینی میں ڈھل جاتی ہیں اور کبھی "میں یہ بھی جانتی ہوں" کا اعلان نمائش اور پر افتخار اظہار بن جاتی ہیں۔

چھٹی' وقت کا تیز' تند' سفاک دھارا ہر آہ و واہ سے بے نیاز ہو کر بہتا رہتا ہے۔

ساتویں' لکھنؤ کا محرم یا اس کا پرتو تقریباً ہر ناول میں نظر آجاتا ہے۔ بجھتی ہوئی شام' اداس رات' ڈھلتا

دن، تہذیب کا سوزِ دروں اور تقدیرِ آدم، کچھ اس قسم کا یہ محرم ان ناولوں میں ملتا ہے۔

آٹھویں، ہجر اور ہجرت سب ناولوں میں ہے۔

نویں، منزلِ نجات کی تلاش ہر ناول میں ہے۔

مماثلتیں اور بھی ہیں مگر یہ چند نمایاں مشترک عناصر ہیں جو ان کے ناولوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح گنتی گنانے کا مقصد قرۃ العین کے ناولوں میں کسی خوبی یا نقص کی طرف توجہ دلانا نہیں بلکہ ناول نگار کے میلانِ طبع اور اس کے ذہنی سفر کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔

قرۃ العین بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کے ناولوں کے نام مختلف ابواب میں جا بجا سلمیٰ ستارے کی طرح ٹنکے ہوئے اشعار (جو بیشتر غیر مروج ہوتے ہیں) اور ایک مخصوص فضا (جو پچھلے پہر کے چار باغ اسٹیشن کی طرح خوابیدہ مگر انتظار میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے) یہ سب ان کے شاعر ہونے کی تصدیق ہے (آگ کا دریا پر لکھتے ہوئے بہت پہلے میں نے لکھا تھا کہ یہ ناول ایک طویل نظم ہے) مگر قرۃ العین کے شاعر ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ کم درجے کی ناول نگار ہیں۔ وہ اس وقت اردو کی سب سے مستند شاعر، ناول نگار ہیں۔ البتہ ادھر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو دہرا رہی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے تقریباً تمام ناول اندھیرے اجالے کا سفر کرتے ہوئے (اجالے کا کم اندھیرے کا زیادہ) اگرچہ مختلف مقامات، حالات اور اوقات سے گزرتے ہیں لیکن اس سفر کا مجموعی تاثر کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ ان کی نوعیتیں ملتی جلتی معلوم ہوتی ہیں اور کبھی اتنے قریب سے سارے ناول گزرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو امتیاز کرنے میں خاصی دقت ہوتی ہے۔ ایک ناول پڑھ کر دوسرا ناول یاد آنے لگتا ہے۔ اس میں یوں تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ یہ ایک ذہنی سفر کا تسلسل بھی ہے مگر پڑھتے پڑھتے ذرا آدمی اکتا بھی سکتا ہے۔

پھر بھی یہ سفر بہت عجیب اور بہت کٹھن ہے۔ یہ دکھی آدمیوں کا سفر اور کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے۔ لکھنؤ سفر کی ابتداء اور انتہا ہے۔ قرۃ العین جب لندن پہنچتی ہیں تو وہاں بھی لکھنؤ ملتا ہے۔ کلکتہ پہنچتی ہیں تو وہاں بھی لکھنؤ۔

''اودھ اور لکھنؤ میں اتنی جاذبیت تھی کہ فرات ہے تو وہ گومتی، سین اور ٹیمز ہیں تو وہ گومتی حد یہ ہے کہ جب وہ دلی پہنچتی ہیں تو وہاں بھی غضب خدا کا لکھنؤ موجود ملتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

رجب علی بیگ سرور دلی پہنچ گئے ہیں...... ذرا ملاحظہ کیجئے...... رجب علی بیگ سرور اور دلی!

''موسم گرما کی صدائیں بدل جاتی ہیں، پھول والے پکارتے...... بہار ہے...... موتیا ہیں...... رنگت کے گھڑے ہیں، لال تربوز...... مرمرا ہے بانس متی کا۔''

ہمیں یقین دلانے کی خاطر کہ وہ واقعی دلی میں ہیں قرۃ العین، میر ناصر علی کی زبان بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ ''لونڈا دلی کی گلیوں کا روڑا ہے۔'' لیکن یقین پھر بھی نہیں آتا۔ وہ لکھنؤ سے روانہ ضرور ہوتی ہیں مگر ادھر قدم اودھ سے باہر نکلا نہیں کہ پھر اودھ میں پہنچ گیا۔ ہم سوچتے ہیں کہ یہ کیا قصہ ہے۔ یہ کیسا سفر ہے، رجب علی بیگ سرور، سرشار، رسوا (دامن پہ غبار لکھنو ہے) ان سب کے ساتھ بھی لکھنؤ تھا مگر ان کا لکھنؤ حقیقی شہر (Real City) تھا۔ قرۃ العین کا لکھنؤ Real اور Unreal City دونوں کے درمیان واقع ہے۔ خواب بھی ہے اور حقیقت بھی۔ ناول نگار کے لئے یہ شہر ایک مابعد الطبیعاتی علامت بن گیا ہے اور اپنی بنیادی خصوصیت میں یہ علامت ایک سوال بن گئی ہے۔ ہم کون ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ ہم ملتے کیوں ہیں، بچھڑتے کیوں ہیں؟ (لکھنؤ کی مشترک ہندو مسلم تہذیب!)

قرۃ العین حیدر وہ واحد ناول نگار ہیں جو تواتر اور تسلسل کے ساتھ آدمی کو تاریخ، تہذیب اور جبر حیات کی پر پیچ راہوں سے گزار کر زندگی کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتی ہیں۔ ان کے سارے ناول، بلکہ ساری تحریریں، اندھیرے میں ایک جھلملاتی زنجیر کی طرح ہیں جن میں سارے کردار بندھے ہوئے ہیں۔ زنجیریں چمک رہی ہیں (جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی) زندگی کتنی روشن زنجیر ہے!

ان ناولوں کی ایک کرشمہ ساز خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس ناول کو بھی پڑھنا شروع کیجئے آپ اپنی موجودہ مقامی اور شخصی زندگی کے حصار کو توڑ کر بہت دور نکل جائیں گے اور وہاں پہنچ جائیں گے جہاں اس موجودہ سے بہت پہلے آپ تھے۔ اس خوشبو سے آپ کی سانس مہک اٹھے گی جسے آپ کھو چکے تھے۔ جسے تلاش کر رہے تھے۔ جسے یاد کر رہے تھے۔

سارے ناول یاد بن جاتے ہیں۔ نرم، شیریں، گداز اور معصوم اور خاموش محبت میں ڈوبی ہوئی یاد۔ وہی صبح، وہی شام، وہی لیمپ، وہی لالٹین، وہی چراغ، وہی چہرے، وہی...... وہی! یہ بڑا مضبوط، پراسرار اور تباہ کن ''وہی''، قرۃ العین حیدر کے یہاں ہے۔

''آگ کا دریا'' کے بعد ''آخر شب کے ہم سفر'' کم زور اور ناکام ناول تھا۔ قرۃ العین اس میں ''جستہ

جستہ'' نظر آتی ہیں۔ فلمی سناریوں کے انداز میں ناول شروع ہوتا تھا اور گراہم گرین کی طرح قرۃ العین نے اسے کچھ جاسوسی کچھ سیاسی اور کچھ مذہبی بنا دیا تھا۔ مگر بات بنی نہیں۔ غالباً انہوں نے سوچا ہوگا کہ آگ کا دریا میں تقسیم کے بعد کا بنگال نہیں ابھرا لہذا کیا اچھا ہو کہ ہندوستان' پاکستان کے بعد ذرا بنگلہ دیش کی بھی سیر ہو جائے مگر یہ سیر بھی سیر حاصل نہ بن سکی۔ قرۃ العین نے ''کامریڈوں'' کے فرسٹیشن کے سوا اس ناول میں اور کچھ پیش نہیں کیا ہے۔ وہ اس ناول میں کچھ منتقم سی بھی بن گئی ہیں جیسے وہ اس خوش گمانی کو دھو دینا چاہتی ہوں جو ''آگ کا دریا'' کی اشاعت کے بعد ترقی پسندوں میں ان کی جانب سے پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس قسم کی خوش گمانی کسی کو بھی نہیں ہونی چاہئے۔ قرۃ العین کی تحریر خواہ وہ پارٹی آفس ہی میں کیوں نہ پہنچ جائے اپنے انداز قد سے پہچانی جا سکتی ہے۔ یاد ش بخیر نیاز فتحپوری نے ان کے ابتدائی افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے نگار (لکھنو) میں انداز تحریر کے بارے میں کچھ اس قسم کی بات کہی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر اترا اترا کے چل رہی ہے۔ نیاز نے اس وقت کچھ اتنا غلط بھی نہیں محسوس کیا تھا۔ عصمت چغتائی نے پوم پوم ڈارلنگ میں کم و بیش کچھ یہی تاثر پیش کیا تھا۔ مگر قرۃ العین جلد ہی اس تنقید کی زد سے دور نکل آئیں اور ان کی تحریر نے اپنے اصل موضوع اور مزاج کو پا لیا۔ ''میرے بھی صنم خانے'' سے ان کی تحریر میں پختگی اور فکر میں دل سوزی پیدا ہونے لگی اور ان کے ''طلبہ کردار'' اپنے اپنے امتحانوں میں فیل یا پاس ہو کر زندگی کے کڑے امتحانات میں پھنس گئے۔ قرۃ العین حیدر کا اسلوب رفتہ رفتہ ایک چراغ بن گیا جسے دکھ نے روشن کیا ہے اور جو دکھوں کو روشن کر رہا ہے۔ یہ باوقار اور با اعتبار اسلوب بن کر نمایاں ہوا۔ جس کی خوش قامتی نے قرۃ العین کو ان کے معاصر ناول نگاروں میں ممتاز بنا دیا۔

البتہ ان کی بعض تحریروں میں کچھ اضمحلال سا معلوم ہوتا ہے (خدا کرے یہ وقتی ہو) اس کے کچھ کچھ آثار ''کار جہاں دراز'' میں ملتے ہیں۔ اٹھان اچھی تھی مگر خاتمے تک پہنچتے پہنچتے مصنف (مصنفہ سے مفہوم ہی بدل جائے گا) اور پڑھنے والے دونوں اکتائے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ قرۃ العین امتحان کے کمرے میں بیٹھی پرچہ حل کر رہی ہیں۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے اور اب وہ جلد جلد اختصار سے سوالات کے سارے پوائنٹ لکھ دینا چاہتی ہیں۔

قرۃ العین کے یہاں پہلے پلاٹ اور کردار نگاری اتنی اہم نہیں ہوئی تھی جتنی فضا۔ ''آخر شب کے ہم سفر'' میں وہ پلاٹ کی تعمیر اور کردار نگاری دونوں کے جوہر دکھانے پر تلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ وہ قرۃ العین جو انسانی تاریخ کی شام کی سرگوشیاں سنا کرتی تھیں صرف پلاٹ کی چرخ چوں سننے میں محو ہو گئیں اور ''آخر شب کے ہم سفر'' کا فضائی تاثر ''پلاٹ گردی'' میں چھپ گیا۔

ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا۔ ''آخر شب کے ہم سفر'' سے قرۃ العین بڑی بدلتی نظر آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناول کو صرف شاعرانہ تاثر کے حوالے کرنا نہیں چاہتیں بلکہ ناول میں اس کی مرکزی خصوصیت یعنی کہانی پن سے بھی جان پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔

''گردش رنگ چمن'' میں کتنا بڑا نام ہے۔ ہر مرتبہ پورا نام لکھنے میں حشو وزوائد کا احساس ہوتا ہے) رومانیت اور شعریت کو دبا دبا کر اور چھپا چھپا کر رکھنے کی شعوری کوشش نمایاں ہے۔ اس میں سخن آرائی کم اور واقعات نویسی زیادہ۔ میں نے قصداً حقیقت نگاری نہیں لکھا ہے۔ اس لئے کہ شاید قرۃ العین کبھی حقیقت نگار نہیں بن سکتیں اور انہیں اس طرف آنا بھی نہیں چاہیئے۔ ان کی افتاد طبع آثار قدیمہ کو شام کے دھندلکے میں دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ قرۃ العین جہاں ہیں وہیں رہنا انہیں زیب دیتا ہے۔ پلاٹ یا کرداروں پر اب جو توجہ وہ دے رہی ہیں یہ کسی طرح بھی اس بات کا اشارہ نہیں ہے کہ وہ اپنی طرز فکر سے علیحدہ ہو جانا چاہتی ہیں۔ حقیقت نگاری ہو یا رومان پسندی، کسی میں کچھ نہیں رکھا۔ ساری بات لکھنے والے کے قلم سے بنتی ہے۔ جس دائرے میں وہ لکھتی ہیں وہاں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔

''گردش رنگ چمن'' (پھر وہی وقت) پڑھنے میں دلچسپ ہے۔ ہم کہانی کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں اور گاہے بگاہے ماضی کی طرف بھی لوٹتے ہیں۔ ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' والی تکنیک سے اس ناول میں بھی جا بجا کام لیا گیا ہے مگر مجموعی حیثیت سے ہم اس الجھن کا شکار نہیں ہوتے جو ''آگ کا دریا'' میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ناول ''آگ کا دریا'' کی طرح کوئی تھیسس نہیں ہے۔ پلاٹ اور کرداروں کو الگ کھڑا کر کے اپنی قوت تحریر کے سہارے، آگے نہیں بڑھتا۔ اس کا پلاٹ ناول کو پڑھوانے میں معاون ہوتا ہے اور کہیں کہیں خاصا پیچیدہ ہو جاتا ہے بلکہ ہماری یادداشت کا امتحان بھی لیتا رہتا ہے۔

"WAW THE PLOT THICKENS & THE MYSTERY DEEPENS."

البتہ بعض ابواب میں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا قصہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ اگر پورا ناول نہ بھی پڑھا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ دشت ماریہ کو پڑھتے وقت شدت سے محسوس ہوا کہ یہ ایک مکمل کہانی ہے جس میں آگے بڑھنے کے امکانات تو موجود ہیں مگر اس کی کہانی جس قدر ہے، جتنی ہے، اپنی جگہ خود قیامت ہے۔

یہ میر کے اس مصرع کی طرح مکمل ہے اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے۔ جس کا مصرعہ ثانی میسر نہ ہوا۔ کس کمال سے یہ باب قرۃ العین نے لکھا ہے اور کتنی جاں گداز اور دل کو مسوستی ہوئی علامت بن کر دشت ماریہ ابھرا ہے۔ یہ باب جہاں ختم ہو جاتا ہے وہاں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ کوئی آنسو، کوئی آہ، کوئی سکی، کوئی مغموم خیال اس ہو کو بیان نہیں کر سکتا جس میں قرۃ العین نے اس باب کو پہنچا دیا ہے۔ وہ آخری پیراگراف میں اردو کے سب سے بڑے ادیب محمد حسین آزاد کی قلمرو میں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ باب کے خاتمے کے بعد واقعی کچھ نہیں رہ جاتا، نواب فاطمہ ختم ہو جاتی ہیں۔

بہر حال یہ ایک احساس ہی ہے۔ ایک کہانی سے دوسری کہانی پھوٹتی جاتی ہے۔ ناول شاخ در شاخ ہو کر بڑھتا رہتا ہے۔ اس کا پھیلاؤ "آگ کا دریا" اور "آخر شب کے ہم سفر" سے کہیں زیادہ ہے۔ "آگ کا دریا" میں تاریخ کا پھیلاؤ ہے۔ یہاں کہانی کا ہے۔ قرۃ العین کے یہاں پہلے دلی نہیں تھی۔ اب "گردش رنگ چمن" میں بالالتزام موجود ہے۔ کلکتہ بھی بڑی تفصیل سے ہے۔ گوہر جان، وائسرائے، اینگلو انڈین، تاجر پیشہ سب کے بارے میں ناول نگار نے عرق ریزی کے ساتھ دادِ تحقیق دی ہے۔ غالباً قرۃ العین کے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔ جس کے تحت وہ رفتہ رفتہ پورے برصغیر کا احاطہ کرنا چاہتی ہیں۔ البتہ پاکستان کے بعض حصے شاید ان کے دائرہ تحریر میں شامل نہ ہو سکیں کیوں کہ ان حصوں (بلوچستان، سرحد) کے تہذیبی عناصر میں ان کے مزاج سے ذرا بیگانگی پائی جاتی ہے۔

"گردشِ رنگ چمن" میں دو عہد ملتے ہیں۔ ایک انتزاع سلطنتِ اودھ اور مغل سلطنت کے زوال کا ہے۔ دوسرا عہد جدید ہے جو جدید لکھنو پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ ناول کے تمام کردار بجز صاحبزادہ دلشاد علی خاں آف دھان پور دیس دیس گھوم پھر کے آخر میں شام کو اپنے کھونٹے پر آ کر بندھ جاتے ہیں۔ لکھنو آئے بغیر انہیں چین نہیں آتا۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی ملحوظ رہے "آگ کا دریا" میں قرۃ العین نے قدیم لکھنو کا رخ نہیں کیا (اسے بھی یہ خاکسار لکھ چکا ہے) اب کی وہ قدیم لکھنؤ میں داخل ہوئی ہیں اور پوری باخبری کے ساتھ۔ چوک اور تحسین کی مسجد دونوں بیک وقت اس میں موجود ہیں۔ "گردشِ رنگ چمن" میں وہ بالغ فکر فن کار بن کر سامنے آئی ہیں اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ واقعی ناول ہے۔ مگر واقعی ہونے کے باوجود یا اسی کی بنا پر یہ اس عظمت اور وقار سے محروم نظر آتا ہے جو آگ کا دریا کو حاصل ہے۔

اس ناول میں قرۃ العین کسی مبحث پر گفتگو کرتے ہوئے کسی تذبذب میں مبتلا نہیں ہیں۔ نہ وہ باتوں کو مخملی خریطوں میں لپیٹ کر پیش کرتی ہیں۔ اس کے مکالمے ان کے اگلے ناولوں کی طرح بند بند اور RESENVED نہیں ہیں۔ کردار ہر موضوع پر فرفر بولتے ہیں بلکہ چیخ پڑتے ہیں۔ (باور کیجئے قرۃ العین کے کردار اب چیخنے بھی لگے ہیں) ناول نگار غیر ضروری طور پر محتاط نہیں ہے۔ اس میں قرۃ العین کھلی ہیں بلکہ بعض جگہوں پر تو شبہ ہوتا ہے کہ وہ عصمت کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

''مسز بھٹنا گر نے پھر ادھر ادھر دیکھا حالانکہ کمرے میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا۔ آہستہ سے بولیں۔'' آپ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا۔ بلبل کی ایک اڑیہ مہترانی تھی، بھنگن، وہ ہماری تائی جی کی جاسوس تھی۔ وہ ٹالی گنج والے بنگلے سے آکر رتی رتی بات انہیں بتلا جاتی تھی۔ اسی نے تائی امی کو بتلا دیا تھا کہ کیا معاملہ ہے کیا نہیں؟''

یہ مکالمہ اس مقام کا ہے جہاں عنبر ایک بحران سے سنبھل چکی ہے اور سید زادی ہونے پر فخر اسے سنبھالے ہوئے ہے کہ مہترانی کی جاسوسی اس سے یہ فخر بھی چھین لیتی ہے۔ (طوائف کی بیٹی تو تھی ہی) اب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے والد گرامی تاؤ جی رائے بہادر امبا پرشاد احقر تھے جو عنبر کی والدہ بلبل عرف محترمہ عندلیب کو رکھے ہوئے تھے۔

ایک اور مکالمے کی آواز سنیے۔

''میری ماں کی تصویریں ردی میں پھینکنے کا حق آپ کو کس نے دیا؟''

''لاعلمی نے۔''

''ڈھونڈیے شاید وہ کیمیو مل جائے۔''

''اب کہاں ملے گا۔ ڈیڑھ سال پرانی بات ہے۔ ہمارے یہاں صبح شام صفائی ہوتی ہے۔ وکیوم کلینر سے الگ اور جھاڑو سے الگ۔''

''اتنے جوتے کھا کے بھی نگار خانم کے دماغ کا خناس نہیں گیا۔ بہت ہی بدعورت ہے۔ عندلیب بانو نے کھولتے ہوئے سوچا ترشی سے بولیں۔ مجھے معلوم ہے۔ جمعداروں کی پلٹن آپ کے گھر کا کوڑا کرکٹ صاف کرتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے ہاں کا ڈرٹی لینن بھی پبلک میں دھلتا ہے۔''

اس نوع کے کھلے ہوئے تیز طرار چبھتے ہوئے مکالمے ناول میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ ناول کی

کہانی اگرچہ پیچ در پیچ ہے اور اس کے تانے بانے دور تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن اسے سمیٹ کر مختصراً کوئی بیان کرنا چاہے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ تشخص ذات کے بحران IDENTITY CRISIS کی کہانی ہے۔

''منصور میں کون ہوں۔'' عنبر سوال کرتی ہے۔ یہی آواز ''آگ کا دریا'' میں بھی ہے مگر وہاں وہ ویدانتی ماورائیت کی آواز بن گئی ہے۔ یہاں ایک کمزور عورت یا لڑکی کی آواز۔

''گردشِ رنگ چمن'' تاریخ کی رفتار اور حالات کے اس جبر کی روداد ہے جس نے شریف زادیوں کو کسبی اور طوائف بنا دیا ہے (دیکھئے خطوطِ غالب) اور ان کی اولاد جو جدید دور میں پہنچ چکی ہے اور جدید تعلیم حاصل کر چکی ہے۔ ''انسابی گلٹ'' سے باخبری کی بناء پر شدید COMPLEX میں مبتلا نظر آتی ہے۔ قرۃ العین نے اسی گلٹ کے احساس کی کہانی بیان کی ہے۔ بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواتین کے مقدمے کی وکالت کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ پردے کی بحث بھی انہوں نے چھیڑ دی ہے۔

قرۃ العین کو علم الانساب سے گہری دلچسپی ہے۔ ''کارِ جہاں راز ہے'' اس دلچسپی کا ثبوت ہے۔ وہی علم الانساب کا ذوق اس ناول میں بھی ہے۔ وہ ایک کلچرل انتھروپولوجسٹ'' معلوم ہوتی ہیں۔ طوائفوں کے سلسلے کی انہوں نے اتنی چھان بین کی ہے کہ یہ ناول جدید امراؤ جان ادا بن گیا ہے۔

اس میں کہانی براہ راست مصنف کے قلم سے بیان نہیں کی گئی ہے۔ یہ کچھ اپنی' کچھ ان کی کچھ خطوط کی زبان سے بیان کی گئی ہے۔ کم وبیش یہ وہی انداز اور تکنیک ہے جو ایملی برانٹے نے اختیار کی ہے۔ ایملی کا ذکر آ ہی گیا ہے تو ایک بات اس حوالے سے ناول میں سمجھ سے باہر ہے کہ قرۃ العین نے جا بجا برانٹے سسٹرز کو طنز کا ہدف بنایا ہے۔ اس ناول میں دو بہنیں نگار اور شہوار بر خود غلط کردار ہیں۔ نگار کو ناول نگاری کا دعویٰ ہے جب کہ بتایا جا چکا ہے کہ شہوار ڈینگو ہے۔ ان دو بہنوں پر برانٹے سسٹرز کو قیاس کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ذوق مزاح کا یہ کوئی اچھا نمونہ نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اپنی ساری اپج' نثری شعر گوئی اور مابعد الطبیعاتی کھوج اور سوچ کے باوجود قرۃ العین HEIGHTS سے خوف زدہ ہیں۔

یوں قرۃ العین صاف ستھرا اور دھیمے مزاج کا ذوق رکھتی ہیں۔ انتہائی سنجیدہ جملے میں چپکے سے ایک لفظ ایسا رکھ دیتی ہیں کہ ذہن تک تبسم کا نور پھیل جاتا ہے۔

''دادی جو کرسچن تھیں' لیکن ہمیشہ غرارہ پہنتی تھیں۔''

"گورارہ، میں نے فوراً جوٹ ڈاؤن کیا۔ مسلم ڈریس۔"

آخری جملہ کنور دلشاد اور نورما ڈریک کے مشترک صاحبزادے کے ذوق تحقیق کا شاہکار ہے جو انگلستان سے ہندوستان کچھ تحقیق، کچھ تفریح کے لئے تشریف لاتے ہیں، صاحبزادے خیر سے انگریزی شاعر بھی ہیں۔

ایک اور ٹکڑا۔

"ہم دونوں کا سامان باہر منگوادیں۔" بجن بی نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

"ماشاءاللہ۔ یہ بات آپ نے سمجھداری کی کری۔"

اس کری کی داد نہیں دی جاسکتی۔ کس قدر برمحل اور بے ساختہ صرف ہوا ہے اور کس قدر دھیما مزاج اس میں پوشیدہ ہے۔

قرۃ العین کے یہاں مزاح کبھی واقعات کے مضحک وقوع پذیری کی صورت میں پیدا ہوتا ہے کبھی کوئی منظر اپنے مضحک انداز میں اسے ابھارتا ہے مگر بیشتر وہ الفاظ سے کھیل کر مزاح پیدا کرتی ہیں جس میں ضلع جگت کا میلان پایا جاتا ہے۔ (لکھنوکی بیگمات کا یہ دلچسپ مشغلہ تھا) یہ انداز کبھی اچھا معلوم ہوا ہے، کبھی اس میں امانت لکھنوی کی روح سما جاتی ہے۔

"P؟" منصور نے بلڈ پریشر کے آلے کی پٹی نگار خانم کے بازو پر باندھتے ہوئے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"جی آپ جانتے ہیں ناں؟ شہوار نے GIGGLE کرنا شروع کیا۔

"PEA یعنی مٹر؟"

"جی نہیں P......P کھی کھی کھی......قہ......قہ......قہ" شہوار کی ہنسی نگار خانم کا قہقہہ۔

"PWS & CONS" منصور نے پوچھا۔

اس قسم کی مزاح خیزی میں کوئی ہرج نہیں۔ یہ مکالمے جن کرداروں کی زبانی ادا ہوئے ہیں ان سے غیر متوقع نہیں ہیں مگر قرۃ العین کے یہاں اس کھیل کی آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہوگئی ہے۔ ممکن ہے یہ ایک مخصوص کھوکھلی موڈرن سوسائٹی کا ہیومر ہو۔

ایک اور چیز اس ناول میں ان کے پہلے کے ناولوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ پائی جاتی ہے۔ وہ ہے

انگریزیت اور انگریزی الفاظ کا استعمال۔ اس ناول میں اتنی بھرمار ہے کہ بدمزگی اور وحشت سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جس تناظر میں وہ کرداروں کو پیش کر رہی ہیں اس میں انگریزی الفاظ لائے بغیر چارا نہیں۔ اینگلو انڈین' خالص انگریز' خالص ہندوستانی انگریز۔ یہ سب لازماً اپنی اپنی بولیاں بولیں گے اور برے بھی نہیں معلوم ہوتے مگر اس ناول میں کچھ زیادہ ہی انگریزی بولی گئی ہے۔ اردو رسم الخط میں انگریزی پڑھنا یوں بھی کیا کم تکلیف دہ امر ہے چہ جائیکہ ہر صفحے پر انگریزی راج ہے۔ اس کے بعد معاملہ پڑھنے والے کی کم علمی کا نہیں رہتا بلکہ مصنف کی اس معاشرے سے خوفناک حد تک وابستگی کا جہاں بات بات میں اس درجہ انگریزی بولی جاتی ہے۔

حیرت ہے کہ قرۃ العین جو خود اس قدر نازک مزاج ہیں اتنی سی بات کو کیوں کر نظر انداز کر دیتی ہیں۔

گفتگو کچھ دور جا پڑی۔ ذکر تھا ناول کی کہانی کا جو چکر دیتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے اور اپنی لپیٹ میں ہم سب کو لے لیتی ہے اور ہم سب طوائفوں کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ ناول ان سب حضرات کی سرگزشت بن جاتا ہے جو اپنی تلاش میں نکلے ہیں۔

اس ناول میں بعض ایسے مقامات بھی آئے ہیں جہاں قرۃ العین کی نفیس نکھری ہوئی معطر ہندوستانیت نئے ہندوستان کے جدید سیاسی مزاج اور اس کے تحت تشکیل پائی ہوئی تہذیب کو برداشت نہیں کر پاتی۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ قرۃ العین خواب دیکھتے رہنے کی بڑی توانائی رکھتی ہیں۔ وہ اگر خواب نہ دیکھیں تو شاید کچھ نہ لکھ پائیں۔ چنانچہ جب ان خوابوں سے بدمذاقی ٹکراتی ہے اور خوابوں کے بکھرنے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے لکھنو بدلنے لگتا ہے۔ خوش مذاق' خوش دلی' پھولوں میں بسا' راگنیوں میں ڈھلا لکھنو' نیتا جی کے بھاشن سے نیم بے ہوشی کے عالم میں پہنچ جاتا ہے تو قرۃ العین اسے برداشت نہیں کر سکتیں۔

"پرانی ELEGANCE غائب' راستوں میں گوبر کے ڈھیر' لکھنو پر اب گائے بھینسوں کی حکومت ہے۔"

کسی صورت میں بھی وہ بدمذاقی اور کم ظرفی کو نظر انداز نہیں کر پاتیں۔

"فارسی میں دریا کو سمندر کہتے ہیں۔ بمبئی کے عوام بھی سمندر کو دریا......"

"وہ ایسی مفرس زبان بولتے ہیں۔"

"ہاں اور معرب بھی' انڈے کو بیدا کہتے ہیں۔ قلی کو حمال کہتے ہیں۔"

(گفتگو عنبر اور منصور کے درمیان ہو رہی ہے)

''ہائے آپ لوگ کتنی اچھی ہندی بولتے ہیں۔ میں نے سنا تھا لکھنو والے بڑی اچھی ہندی بولتے ہیں۔'' مسز بھٹناگر نے داد دی۔

''جی ہم لوگ اردو بول رہے ہیں۔'' منصور نے جل کر جواب دیا اور اہل لکھنو اردو بولتے ہیں۔

''اردو، ہائے اردو میں بھی تھوڑی سمجھ لیتی ہوں۔ بڑی سوئیٹ لینگویج ہے۔ میرے تاؤ جی تو کیول اردو ہی جانتے تھے۔''

اور آگے۔

''میری طبیعت لکھنو آکر خراب ہو گئی ہے۔ آب و ہوا کی تبدیلی۔'' فوراً خیال آیا کہ مستقل اردو بول رہی ہیں۔ سامنے پڑے ہوئے FAMINA پر نظر ڈال کر کہا۔ ''یہ بیگم حسین کتنے دچتر لیکھ لکھتی ہیں۔''

کتنا طنز، کتنا زہر، کتنی سفا کی ان بظاہر بے خبر سے مکالموں میں ہے۔ یہ کوئی معمولی مکالمے ہی نہیں۔ بڑی فنکاری کے ساتھ قرۃ العین نے تہذیبی تنگ نظری کی جدید تاریخ ان میں بند کر دی ہے۔

تہذیب کے عروج و زوال کی کہانی بھی عجیب چیز ہے۔ بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے تو دکھ کا حسن اور جب زوال پذیر ہوتی ہے تو حسن کا دکھ بن جاتی ہے۔ ''سردم، دھکم، دھم...... چوں شد، شہید شد، یکجا...... دشت ماریہ''

قرۃ العین تہذیبی دکھ کی بہت بڑی امانتدار ہیں۔ ان کے تمام ناولوں میں یہ امانت لعل شب چراغ بن گئی ہے۔ اسی امانت نے انہیں ذکی الحس بنا دیا ہے۔ نزاکت احساس ان کے نالوں میں کلی بن کر کھلتی ہے۔ دو تین جملوں میں وہ چھپے ہوئے زخموں کو مزید چھپا کر اس طرح پیش کرتی ہیں کہ زخم کی گہرائی ہم دیکھ لیتے ہیں۔ یہ عجیب ہنر ہے۔

''پلکیں ساری کے کوئے سے چھوئیں گویا آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔ اسے نکال رہی ہیں۔'' یہ تجاہل عارفانہ'' قسم کا تکنیکی انداز بیان ہے۔ ذکر نواب فاطمہ کا ہے جواب عندلیب بانو اور سن رسیدہ ہو چکی ہیں۔ سرخ پٹاری کھولے ہوئے اپنی گڑیوں کو دیکھ رہی ہیں۔ نزاکت احساس کے اظہار کا باوقار انداز ناول میں بڑے پرتاثیر انداز میں ملتا رہتا ہے۔

قرۃ العین نے اس ناول میں چند حقائق یا نتائج سے ہمیں آگاہ کیا ہے اور چند مژدہ ہائے جانفزا بھی

سنائے ہیں۔ کلچرل تاریخ کے مطالعے سے انہوں نے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے۔ سنیے۔

''اپنی تمام خرابیوں کے باوجود کردار سازی فیوڈلزم کا ایک وصف تھا۔ آج کردار کی تباہی......

(مسز بیگ کا مکالمہ)

دوسرا اہم نتیجہ: تھرڈ ورلڈ کردار کے بحران میں مبتلا ہے۔

مژدہ جانفزا: اردو زندہ رہے گی' کنور کا پرجوش جملہ۔

ایک آدھ جگہ نصیحتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً سنیاسی ہو گیا۔'' کو اب ختم ہو جانا چاہئے۔

ان کے ناولوں کی کہانی عالیشان پس منظر (GREND SETTING) میں حرکت کرتی ہے۔ ناول میں بابجا محرابیں' برجیاں' گنبد' مینار' بارہ دری اور ایوان' شام کو جھٹپٹے میں ابھرتے رہتے ہیں۔ ان ناولوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ بڑی محنت' جانکاہی اور مسلسل ڈیسک ورک کے بعد تکمیل تک پہنچے ہیں۔ قرۃ العین کسی واقعہ یا مقام سے سرسری طور سے گزر جانے کی قائل نہیں۔

مشاہدے' مطالعے' تاریخی تحقیق' گم شدہ لفظوں کی بازیابی اور مصنف کی حیرت انگیز یادداشت نے گردشِ رنگ چمن کو پڑھنے والوں کے لئے ایک روح پرور اور ذہن افروز سیاحت کا حاصل بنا دیا ہے۔

قرۃ العین کو قدیم سے گہری دلچسپی ہے اور قدیم بھی وہ جس پر لوگوں کی نظر کم پڑی ہو۔ اشعار کے اقتباس میں بھی یہی معاملہ ہے۔ بعض شعراء کے نام درج کرنے میں بھی یہی خیال رکھا گیا ہے۔ ''خاقانی ہند خواجہ عزیز لکھنوی'' کا نام لے کر وہ بہت سے آدمیوں کو چونکا سکتی ہیں کہ یہ دوسرے خاقانی ہند کون نکل آئے۔ حالانکہ خواجہ عزیز لکھنوی کے حالات قلم بند کئے جا چکے ہیں مگر کمیاب ہیں۔ ان کی فارسی دانی اور (مرزا)' دبیر شناسی سے ادب کے طالب علم شاید زیادہ آگاہ نہ ہوں۔ اسی طرح بعض جگہ ایسے ایسے لفظ وہ ڈھونڈ کر لائی ہیں کہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ امتحان تو نہیں لے رہی ہیں۔ ''آپ کو ان گہنوں کے نام معلوم ہیں؟''

ناول نگاری میں یہ رجحان کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہ نک چڑھا پن SNOBBERY ہے۔

ایک جگہ میر فرش کا لفظ انہوں نے استعمال کیا ہے اور بالکل اصلی اور لغوی معنوں میں۔ اب اس لفظ کا ایک دوسرے پہلو سے بھی استعمال دیکھ لیجیے

بولا خر تیری امارت بھی بھلا شے ہے کوئی
میر فرش ایسے امیروں کو سمجھتے ہیں جری

یہ میر نفیس کے نواسے حضرت عارف لکھنوی ہیں (ایک مرثیے میں حر کی پسر سعد سے گفتگو نظم کی ہے)

"گردشِ رنگِ چمن" میں قرۃ العین کی ہمہ گیر یادداشت' ان کا علم کتابی' علم مجلسی اور ذوق نقاشی امنڈ امڈ کر اس طرح برسا ہے کہ پڑھنے والوں کے لئے سطریں بعض جگہ پھسلنی راہیں بن گئی ہیں۔ راگوں کے نام' بندشیں' رقص کے توڑے' ترانہ' قول' شاستریہ سنگیت' مصوری' فلم' ست جترے' فرا' ادبا' سودا' انشا' انیس' اکبرالہٰ آبادی' اقبال ٹیگور' دتاتریہ کیفی' راجہ صاحب محمود آباد' علامہ رشید ترابی' فقہی مکاتیب' فرنگی محل غفراں مآب کا امام باڑہ' گوٹے' لچکے والے' سرسوتی' لکشمی' دشنو کا گرڑ اوتار' HOBSON JOBSON' بھانڈ' طوائفیں' راسکل' سب اس ناول میں ہیں۔ کوئی بھی اس ناول کو پڑھے۔ قرۃ العین کے علم دریاؤ سے مشکل ہی سے انکار کرسکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک خیال کبھی کبھی بدگمانی بن کر ابھرتا ہے کہ ناول میں اتنی چیزیں بھر دینے سے ناول محترمہ نگار خانم کے "آبشار والے کمرے" کے مانند تو نہیں بنتا جارہا ہے۔

مگر یہ بدگمانی قرۃ العین کے موقع شناس قلم سے جلد ہی دور ہو جاتی ہے۔ جس چیز کا بھی تذکرہ ہے بے محل اور بے موقع نہیں ہے۔ ہر چیز اور ہر نام اپنی اپنی جگہ اپنے محفل استعمال کا محکم جواز بن جاتا ہے۔ بڑا سلیقہ ہے قرۃ العین کی تحریر میں۔

سرخ تول کی کرنیں' کالے دھاگے سے بنی لمبی چوٹی' گوٹے کا موباف' پوتھ کا چھوٹی' گوٹ کا دلی والا غرارہ' ریشمی سلوکہ اور دوپٹہ زری کی جوتی' ناک میں چاندی کا بلاق۔

گلڈ مبر' پالکی تا کی' بوچے' تامجان' ٹمٹم' کوچ' ہاتھی برسوں ان کی سواری میں رہے اور یہ الفاظ تو دیکھئے یا سنیے۔ حرافہ' علامہ' شغتل' قطامہ' دفاقہ' قلماقنی' حیلہ' مال زادی' سحرالبیان اور گلزار نسیم کا لطف آجاتا ہے۔ آج ان الفاظ کو برتنا تو درکنار جاننے والے بھی شاید کم نکلیں۔ ہائے جوش صاحب۔ اپنے ساتھ شعر گوئی کی قوت اور شاعری کی عظمت لے گئے

میٹھی ہے وہ زبان کی دل کی کٹھور ہے
قطامہ ہے' چڑیل ہے شغتل ہے' چور ہے
ڈگڈگی اس میں گھات ہے ڈائن کا زور ہے
اس کا نہ اور ہے کوئی بیٹا نہ چھور ہے

نارو منی کی بھی ہے وہ نانی سمجھ گئی
پیچھے کچھ اور منہ پہ ممانی سمجھ گئی
پتھر کی طرح سخت ہوں ڈھیلا نہیں ہوں میں
چندا لانے مجھ کو بیٹھی ہے خیلا نہیں ہوں میں

......

قرۃ العین کو پڑھتے ہوئے کئی بار جوش صاحب یاد آئے۔ پھر لکھنؤ یاد آیا' پھر جوش صاحب یاد آئے۔
جس طرح جوش صاحب نے اپنے موقلم سے لفظوں کو جوہی' چمبیلی' موتیا' گلاب' گیندا' تاج محل' لال قلعہ' مٹیا برج اور لکھنؤ بنا دیا ہے۔ اسی طرح قرۃ العین نے پرانے لفظوں کو نئی زندگی' نیا مزاج اور نیا آدرش دیا ہے۔ جی ہاں آدرش۔ ہر لفظ ہم سے کہتا ہے کہ ہمیں پڑھ لو سمجھ لو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تہذیب کیا ہے۔ نیکی کیا ہے۔ بدی کیا ہے۔ جدید کسے کہتے ہیں اور اس میں قدیم کتنا حل ہے۔
ان الفاظ کو برتنے میں قرۃ العین نے بڑی چابکدستی دکھائی ہے۔ کہیں بھی تصنع کا شبہ نہیں ہوتا اور نہ تحریر LABOURED معلوم ہوتی ہے۔ بڑی بے ساختگی سے یہ الفاظ آتے ہیں۔ ایک جملہ دیکھئے۔
''کرنل ڈالٹن تیسرے پہر کے قریب پہنچا۔ وہ ٹھاکر صاحب سے ایک مرتبہ بیکانیر میں مل چکا تھا۔
ہاتھی کا حافظ رکھتا تھا۔
ہاتھی کا حافظ کیا خوب آیا ہے۔ (اس فیل کو یاد ہند آئی)
ایک اور جملہ'' آپ ایک عصا سنبھال کر چند منٹ تک بھیڑوں کو ہر ہر کرتے پھر کار میں بیٹھ کر قلعے واپس چلے جاتے۔''
ہر ہر کی آواز کیا لطف دے رہی ہے۔
قرۃ العین کی تحریر کی خوش ادائی' دل فریبی' اثر انگیزی الفاظ کے سارے لکڑ پتھر ہضم کر دیتی ہے۔
پہلے کہیں بیان کیا جا چکا ہے کہ اس ناول میں انہوں نے کوشش کر کے کم سے کم شاعری کی ہے۔ پھر بھی ان کے فقرے' ان کے الفاظ بلکہ کبھی کبھی صرف ایک لفظ حاصل غزل بن کر دیر تک گونجتا رہتا ہے۔
''گیس کے لیمپ میں ہوا بھرتے جاؤ تو رفتہ رفتہ روشن ہوتا ہے۔ اسی طرح بوڑھے دھاڑی کے الفاظ ذہن کے دھندلکے میں اجاگر ہوئے۔

یہ حسن مشاہدہ ہی نہیں، شعری انکشاف بھی ہے۔

......

''برسات کی وجہ سے صحرا اچانک سرسبز ہو چکا تھا۔''

کیا بے ساختہ مصرعہ ہے۔

دور تک پھیلی ہوئی کتنی تراوٹ ہے اس میں
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

......

''ایسی تاروں بھری کالی رات۔ آکاش گنگا کیسی جھلملا رہی ہے۔''

یہ شاعری نہیں تو اور کیا ہے۔ مرزا پور کی کجری یاد آ گئی۔

اور سنیے اور سر دھنیے۔

''چوتھی تاریخ کا چاند سنہرے غزال کی طرح متحرک بادلوں میں چوکڑی بھرتا معلوم ہوا۔'' کتنی FANTASTIC امیج ہے۔

''گردشِ رنگِ چمن'' میں اس قسم کے مصرعے جا بجا داد طلب ہیں مگر ناول کی کہانی ان مصرعوں سے ماند نہیں پڑتی۔ اس کی دلچسپی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ قرۃ العین کے پہلے ناولوں کے مقابلے میں اس میں کرداروں کی بہتات ہے۔ یہ کردار اپنی کیفیتوں، نوعیتوں اور ذہنیتوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کی وجہ سے کہانی میں تنوع اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کردار ناول کو منکشف کرتے رہتے ہیں۔ ہر کردار اہم ہے۔ ناول کی بنیادوں کو پختہ کرنے میں ہر چھوٹا کردار اور واقعہ اہمیت رکھتا ہے اور جب ناول کی عمارت تعمیر ہو چکتی ہے تو چھوٹے چھوٹے کردار رخصت ہو جاتے ہیں اور اس میں اصل کردار آباد ہونے لگتے ہیں۔

مس نواب بائی آف جے پور اور عندلیب بانو خاصے اہم کردار ہیں۔ دونوں تاریخی جبر کا ایک منطقی سلسلہ اور فکر و عمل میں اس کا جواز بنے ہوئے ہیں۔ نواب بیگم جذباتی ہیں۔ دل کی کشادہ ہیں۔ ان کا ماضی ان میں زندہ ہے۔ قدم قدم پر سہارا چاہتی ہیں اور اسی کی سزا پاتی ہیں۔

عندلیب نواب بیگم کی بیٹی ہے۔ ماں سے مختلف ہے۔ تجربات نے اسے سخت مزاج بنا دیا ہے۔

قدرے غیر جذباتی اور جز رس ہے۔ بظاہر وہ ماں کی ضد معلوم ہوتی ہے۔ امراؤ جان ادا کی خانم کی طرح وہ حقیقت پسند بھی ہے۔ خوابوں کی دنیا سے نکل کر اپنی بیٹی عنبر کے لئے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتی ہے جہاں شجرۂ نسب کا بھوت نہ ہو۔ مگر لاکھ جتن کے باوجود عنبر سے یہ بھوت جدا ہو نہیں پاتا اور عندلیب (مسز بیگ) اپنی تمام زیرکی، دانائی، صاف گوئی، پیش بندی کے باوجود اندر ہی اندر ٹوٹتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ضبط کھو دیتی ہے۔

عنبر اپنی ماں کی ضد ہے، سیدھی سادی، جذباتی، محبت کی پیاسی، دبی ہوئی رقابت کی ماری، ڈاکٹر منصور پر تکیہ کئے ہوئے۔ اسی کے سہارے زندگی کے طوفان سے گزرنا چاہتی ہے۔

یہ تینوں کردار، نواب بانو، مسز بیگ اور عنبر شکستہ کشتی پر ساحل کی تلاش میں ہیں مگر ساحل دور ہوتا جاتا ہے۔ عنبر اپنے کو سمجھنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر منصور سے پوچھتی مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔ اپنی ماں کے برعکس اس میں مذہبی جذبہ یا ہیجان ہے۔

''تمہارا یہ خالص مذہبی ری ایکشن ہے۔'' منصور نے تعجب سے کہا۔

''ہاں نواب بیگم حد سے زیادہ مذہب پرست تھیں۔ ان کے ری ایکشن میں امی بے دین ہو گئیں۔ امی کی بے دینی کے ری ایکشن میں، میں بہت پابند مذہب ہوں اور شاید تھوڑی سی MYSTICAL بھی۔''

عنبر اپنی ماں کو بے دین سمجھتی ہے اور اس کے سارے شواہد بھی ناول میں مہیا کر دیئے گئے ہیں مگر ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ وہ اندر ہی اندر شہید ہو رہی ہیں۔ عنبر اس شہادت کی آواز بلند ہے۔

''رکشا پر بیٹھی بیٹھی ماتم کرتی۔ وہ بڑی غضبناک معلوم ہوتی گویا شیر پر سوار درگا

اشک خونیں ہیں بھرے دیدۂ خونبار میں
آئے ہیں پرسے کو ہم آپ کی سرکار میں
حسینؑ حسینؑ حسینؑ حسینؑ حسینؑ حسینؑ

یہی آواز ایک دوسرے انداز میں ناول کے آغاز میں آتی اور ناول کے آخر میں بھی۔ گویا پورا ناول ایک شہادت نامہ ہے۔

انہیں کرداروں سے منسلک فلومینا بھی ہے۔ یہ نواب بیگم کی ملازمہ ہے اور غالب کی وفادار بیگ معلوم ہوتی ہے۔ فلومینا کرسچین ہے اور کرسچین اردو بولتی ہے۔ بظاہر COMIC کردار ہے۔ اس کی اردو سن کر

مزاح کا لطف آتا ہے لیکن یہ اتنا مزاحیہ کردار بھی نہیں ہے۔ فلومینا میں معاملہ فہمی، وقار اور وفا ہے۔ بعض مواقع پر اس کی باتیں اور بات کرنے کا انداز الیے کی بلندی کی طرف بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

فلومینا کا ایک مکالمہ سنیے۔ یہ اس موقع پر ہے جب عندلیب اپنی جان چھڑکنے والی ماں نواب بیگم کو ترکی بہ ترکی جواب دے چکی ہے۔ خود عندلیب اس منظر کو بیان کر رہی ہے۔

''فلومینا نے ان کا کوٹ وارڈ روب میں ٹانگا۔ پلٹ کر ایک لمحے کے لئے ساکت کھڑی رہی پھر بلی کی طرح دبے پاؤں چلتی میرے قریب آئی اور میرے گال پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا میری قوت گویائی سلب ہوگئی۔ فلومینا نے مجھے بے انتہا لاڈ پیار سے پالا تھا اور مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔

اب اس نے کمرے میں گشت کرتے ہوئے آتش بار آواز میں کہنا شروع کیا۔

''لک ہیر مس پیری، تم اپنی انجل مدر کو کیا بولا...... پھر سے بولو۔ تم اپنی ماما سے ماپھی مانگو، سوری بولو، تمہارا مدر تمہارے واسطے کیا مصیبت اٹھایا۔ کیسا ٹرابل دیکھا تم اس کو LOOSE WOMAN بولتا۔ تم کو مالوم تم کو BEST اسکول میں بھیجنے واسطے تم کو LUXURY میں رکھنے واسطے وہ جیز جستی ایسا لائف LEAD کرتا۔''

مزاح اور المیہ کی گلے مل رہی ہے۔ SYNGE اور بر یخت دونوں ان مکالموں میں موجود ہیں۔

فلومینا ناول میں اگرچہ چھوٹا کردار ہے مگر بڑا مضبوط کردار ہے۔ اس میں بڑی جان ہے۔ دوسرا کردار جو معاملہ فہم اور موقع شناس ہے اور ڈاکٹر منصور کا ہے۔ منصور کا تعلق مڈل کلاس سے ہے اور غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خراب نہیں ہوتا ورنہ بیشتر کردار فیوڈل بیک گراؤنڈ رکھتے ہیں۔ (ایک طرح یہ پورا ناول ہی فیوڈل بیک گراؤنڈ میں لکھا گیا ہے۔) منصور نے اپنی محنت شاقہ سے اپنے کو بنایا ہے۔ ذہین ہے۔ کچھ دنیا دار بھی ہے۔ بدسرشت نہیں ہے خود پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہے۔ کماتا ہے۔ کھاتا ہے۔ خود مکتفی ہے۔ کبھی کبھی من موجی بھی معلوم ہوتا ہے مگر مجموعی حیثیت سے متوازن ہے۔ مسز بیگ، عنبر نگار خانم، شہوار خانم کی غیر متوازن اور قدرے غیر حقیقی دنیا میں وہ حقیقی کردار اور توازن کا ستون ہے جس کا سہارا سب لینا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مسز بیگ بھی مگر اتنا پر اعتماد آدمی ستون تو بن سکتا ہے ٹوٹ کے محبت نہیں کر سکتا۔ سہارا دے سکتا ہے۔ محبت نہیں دے سکتا۔ پھر بھی ڈاکٹر منصور زندہ کردار ہے۔ دلچسپ ہے اور بسلامتی ہوش وحواس گفتگو کرتا ہے۔

ایک اور کردار جسے قرۃ العین نے زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ دلن میاں کا ہے۔ یہ حضرت ایک چھوٹے سے تعلقدار کے بھتیجے ہیں۔ ''اگر آپ کو بگڑے ہوئے رئیس زادے اور چارمنگ راسکل کی صحیح اور دلکش تصویر دیکھنی منظور ہے تو کسی شام چھتر منزل کلب یا دلکشا کلب جا کر کنور دلشاد علی خاں آف دھان پور سے ملنا چاہئے۔ یہ نوجوان لا مارٹینیر لکھنو سے انٹرمیڈیٹ نہیں کر پایا تھا۔ البتہ تاش کا ماہر تھا' بیلہ اچھا بجاتا تھا' اپنے تایا کو بہت مانتا' ان کا ادب کرتا تھا اور ان کو چونا لگانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔''

اب اس کردار کے بارے میں مزید بتانے کے لئے رہ کیا گیا ہے۔

انہیں کی دوسری شبیہہ بھی ملاحظہ ہو۔ ''صاحبزادہ صاحب اپنی کنپٹی کے گرے بالوں اور وجیہہ شخصیت کی وجہ سے ہر بین الاقوامی مجمع میں ممتاز نظر آسکتے تھے۔

یہ ہیں صاحبزادے صاحب جو نورماڈریک کی پارٹنرشپ میں ہر قسم کے منشی کاروبار میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ناول نگار نے ہمیں باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ صاحب زادہ صاحب بڑے عورت مار اسمارٹ اور بین الاقوامی قسم کے جرائم پیشہ ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا تعلق مافیا سے بھی ہے لیکن یہ ساری داستان ہم ناول نگار ہی کی زبانی سنتے ہیں۔ صاحبزادہ دلشاد خود کوئی ایسا کارنامہ انجام دیتے نظر نہیں آتے جس سے یقین آجائے کہ وہ واقعی پڑھنے والوں کو سسپنس میں مبتلا کر سکتے ہیں اور بڑے تیس مار خاں ہیں۔ نگار خانم اور شہوار خانم کو بلیک میل کرنے کے لئے مغرب سے پرواز کر کے مشرق پہنچتے ہیں اور یہ مشرق لکھنؤ ہے۔ مگر بلیک میلنگ بھول کر نیکی کے راستے پر چل نکلتے ہیں۔ ان کی زندگی میں انقلاب آجاتا ہے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ لکھنو میں صاحبزادہ صاحب کی ملاقات اچانک ان کے پرانے یار کنور سینڈی' سندریش نرائن سنگھ سے ہو جاتی ہے۔ ان کی کنپٹیوں پر بھی گرے بال ہیں۔ اس ملاقات مسیحا و خضر کے نتیجے میں صاحبزادہ بلند اقبال' کنور صاحب کے ساتھ بارہ بنکی کا چکر لگانے یا پرانی یادیں تازہ کرنے پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ اسی چکر میں کنور صاحب' صاحب زادہ صاحب کو میاں سے ملواتے ہیں۔ میاں کے نام نامی اسم گرامی سے ہمیں اس ناول میں آشنا نہیں کیا جاتا۔ یہ حد احترام ہے۔ میاں بہت پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔ طرز جدید کے صوفی ہیں۔ بڑے روشن خیال' روشن ضمیر' کشادہ دل' خوش اخلاق' خوش گفتار' خوش خصال' خوش جمال ہیں۔ کبھی مشرقی لباس میں' کبھی مغربی لباس میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ کار چلاتے ہیں' سگریٹ پیتے ہیں' حقے کا کش لگاتے ہیں' ٹی وی دیکھتے ہیں' قوالی اور بھجن سنتے ہیں۔ مرجع

خلائق ہیں۔ ہندو مسلم دونوں ان سے بے انتہا عقیدت رکھتے ہیں۔ تصوف اور بھگتی کے دقیق مسائل پر نہایت آسان زبان میں نہایت بلیغ گفتگو کرتے ہیں۔ مغربی ممالک کی خواتین بھی ان سے تجلی حاصل کرتی ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ میاں یعنی مرشد گرامی میں وہ تمام اصناف مجتمع ہو گئے ہیں جو مولانا عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے ہیرو میں پائے جاتے ہیں۔

ناول نگار نے میاں کے ذکر میں بڑے ادب اور احترام سے کام لیا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ناول نگار میاں کی عقیدت سے سرشار ہے۔ بڑی پاکی اور پوترتا کے ساتھ میاں کا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ البتہ ان کے مجاہدات کے بیان میں طوالت ہو گئی ہے اور کہانی DRAG کرنے لگتی ہے لیکن اس کردار سے ہمیں متعارف کرانے میں ناول نگار کے پیش نظر خاصہ اہم مقصد ہے۔ میاں ہندو مسلم مشترک تہذیب کی بابرکت اور حسن آفریں علامت ہیں۔ دیکھنے بلکہ یاد رکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ صاحب زادہ صاحب کو میاں کے پاس ایک ہندو عقیدت مند لے گیا ہے۔ کنور سندیش سنگھ ہی میاں کے بارے میں دلشاد علی خاں کو مطلع کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"مرشد، عاشق حسین ہیں۔ محرم میں تعزیہ داری کرتے ہیں۔ ایک روز حضرت علی کے متعلق فرما رہے تھے۔ ارے ہمیں جو کچھ سامان ملتا ہے شاہ ولایت ہی سے ملتا ہے۔ سامان میاں کا مخصوص لفظ ہے۔ ان کی مراد اپنی ولایت سے تھی۔"

میاں میں اودھ کا سارا حسن سمٹ آیا ہے۔ میاں غالباً کوئی افسانوی کردار بھی نہیں ہیں۔ ناول کے آخر میں جن افسانوی کرداروں کے نام گنائے گئے ہیں میاں اس میں شامل نہیں ہیں۔ بہر حال معاملہ جو کچھ بھی ہو ناول میں میاں کی آمد ایک RELIGIOUS EXPERIENCE ہے۔ دنیا کے کئی بڑے ناول نگار اس مذہبی تجربے سے گزرے ہیں۔ ہرمن ہس، ٹالسٹائے، دوستووسکی۔

قرۃ العین نے اس کردار سے کچھ کرامتیں بھی وابستہ کر دی ہیں کہ پڑھنے والے کو داستان کا مزا آ جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض دانشمند حضرات اس کردار کو بے یقینی کی نظر سے بھی دیکھیں لیکن ایک بات طے ہے کہ ناول نگار کی نظر میں یہ کردار عہد جدید میں گہری معنویت رکھتا ہے۔ ہر طرف سے تھک ہار کر جھک مار کر دنیا جہاں کی ٹھوکریں کھا کر، نامہ اعمال اچھی طرح سیاہ کر کے کسی آستانے پر سر جھکا کر سکون قلب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قرۃ العین نے ناول میں یہ آستانہ ڈھونڈ نکالا ہے۔

میاں کی باتوں میں شفا ہے۔ خاموشی میں شفا ہے۔ نظر میں شفا ہے۔ دلن بھیا جو ایک چھٹے ہوئے شخص تھے۔ میاں کی صحبت میں چند دنوں رہ کر شفایاب ہو جاتے ہیں۔ گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ نیک چلنی اور نیک پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ پہلی بار ہے کہ مس حیدر کے ناول میں کسی کو راہ نجات ملی ہے۔

دلن بھیا نے ڈاکٹر منصور کو بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ عنبر کے دماغی علاج کے سلسلے میں میاں سے رجوع کریں مگر ڈاکٹر عقل پسند ہے۔ ان باتوں کا قائل نہیں، اس طرف نہیں آتا۔

نتیجتاً:۔

(i) عنبر شفایاب نہیں ہو پائی۔ ڈاکٹر منصور کی ساری طبی قابلیت اور مغرب کی عقل دوستی دھری رہ جاتی ہے۔ مغرب سکونِ قلب سے خود محروم ہے وہ کسی کو کیا سکون قلب دے گا۔

(ii) صاحبزادہ جو راسکل، کارڈ شاپر، قحبہ خانے کا سرپرست وغیرہ وغیرہ ہے شفایاب ہو جاتا ہے۔ مشرق سکون قلب دے سکتا ہے بشرطیکہ کوئی تلاش کرے۔

اس ناول کا آخری کردار تاریخ ہے۔ فلک پیر کی طرح ظالم، جابر، حاسد، اندھی قوت، سفاک، قدموں کی دھمک سے عظیم تہذیبوں کے غرور کو توڑتی ہوئی تاریخ ماضی ہے اور ماضی رات ہے اور رات آسیب ہے اور خوف ہے۔

"سرائے طغرل بیگ میں مشعلوں کا دھواں اور بارود کا دھواں بھٹیارنوں اور باربرداری کی دہشت زدہ چیخیں۔ ایک زخمی لنگڑا کتا اپنے مردہ آقا کے پاس بیٹھا پنجوں سے زمین کرید رہا ہے۔ شاید قبر کھودنا چاہتا ہے۔ سرائے کے پچھواڑے بڑ کے گھونسلوں کی طرح درختوں سے لٹکتے ہوئے مزید مقتول مجاہدین، رات جب جھکڑ چلا لاشیں گول گول گھومنے لگیں۔ تلنگوں کی کمپنی ان کو بتیاں سمجھ کر بہت ڈری۔"

"اندر سرائے میں سرشام بھیرو ناچ گیا۔ پھر وہ اپنے بیل پر بیٹھ کر دوسرے شمشانوں کی سمت نکل گیا۔ جن کے مردوں کی راکھ اپنے انگ پر مل کر سمادھی لگائے گا۔"

یہ ہے تاریخ کا فکابوس۔ قرۃ العین نے اس منظر کو بھیانک انداز میں ابھارا ہے جو کافکا کے بعض مناظر کی طرح آسیبی ہے۔

قرۃ العین کے یہاں تاریخ کا مہیب تعاقب ہے۔ ان کے کردار تاریخ سے ہٹ کر بھی سوچنا چاہتے ہیں مگر سوچ نہیں سکتے۔ اس سے آزاد ہونا چاہتے ہیں مگر آزاد نہیں ہو سکتے۔ وہ تاریخ کی آہنی زنجیروں میں

اسیر ہیں۔

''اینٹ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں تولا' پھر طاقت کے ساتھ اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش میں منہمک ہو گئے۔'' مگر زنجیر ٹوٹ نہ سکی۔ ستم تو یہ ہے کہ خود قرۃ العین حیدر ان زنجیروں کو توڑنا نہیں چاہتیں۔ تاریخ کے بوجھ کا یہی احساس' یہی شعور ان کی تحریروں کی توانائی بھی ہے۔ ان کا تاریخی وژن دراصل تاریخ کی از سر نو دریافت ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

گردش رنگ چمن میں یہ بڑی بات ملتی ہے۔ تاریخ اس میں زندہ مگر ایک پراسرار کردار ہے۔ اس ناول کا ایک اور کردار بھی ہے۔ سب سے بڑا سب پر حاوی' وہ خود قرۃ العین حیدر ہیں۔ آدمی کے دکھوں کی دردمند مفسر۔ ''مجھ سے محبت کرنے والا کوئی نہیں۔ سوائے میری کمزور اور لاچار ماں کے۔''

یہ آواز دکھ ہے اور محبت بھی دکھ ہے۔

''آگ کا دریا'' کے بعد ''گردشِ رنگ چمن'' قرۃ العین کا دوسرا اہم ترین اور کہانی کے لحاظ سے سب سے کامیاب ناول ہے اس کا بیشتر حصہ زمین پر لکھا گیا ہے۔ آگ کا دریا' ہمالیہ کا سلسلہ ہے۔ گردش رنگ چمن ہمالیہ سے پھوٹی ہوئی گنگا ہے جس کا پاٹ میدان میں پہنچ کر اتنا چوڑا ہو گیا ہے کہ ایک کنارے پر کھڑے ہو کر دوسرا کنارا نظر نہیں آتا۔ دور تک دھند پھیلی ہوئی ہے۔ ہم سب ایک کنارے پر کھڑے دوسرے کنارے کو دیکھنے میں کوشاں ہیں۔

دوسرے کنارے پر کیا ہے؟ کون ہے؟

''گردشِ رنگِ چمن'' ایک مسلسل سوال ہے۔

قرۃ العین حیدر یہ ناول بھی لکھ چکیں۔ اب انہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے یا نہیں۔

(جولائی 1989ء)

پروفیسر مجتبیٰ حسین

اردو غزل کے 25 سال

45ء میں دوسری عالمی جنگ ختم ہوئی اور مغربی استعمار نے تیسری عالمی جنگ کی سازشیں اور تیاریاں شروع کر دیں مگر دنیا کے لوگ ایک ویرانے سے دوسرے ویرانے میں جانے پر رضا مند نہیں تھے۔ فسطائیت اور بورژوا جمہوریت اس جنگ میں بری طرح زخمی ہو چکی تھی۔ مقبوضہ اور نیم مقبوضہ علاقوں میں آزادی کی جدوجہد تیز ہو رہی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کی تمام اعصاب شکنی کے باوجود عوامی تحریکیں مغربی استعمار کی طنابیں یکے بعد دیگرے کاٹ رہی تھیں۔ اسی لئے ادب و شعر میں جہاں ہیروشیما اور ناگاساکی کا نوحہ تھا وہاں آزادی حاصل کرنے، آزاد رہنے اور استعماری جنگوں سے نجات حاصل کرنے کا ولولہ بھی تھا۔

47ء میں برصغیر تقسیم ہو گیا اور برطانوی حکومت چلتے چلاتے آزادی کے تحفے کے طور پر فسادات کا ایک اندوہناک سلسلے دے گئی۔ ادیبوں اور شاعروں کا رویہ بھی اس آشوب ہلاکت میں مجموعی طور پر صحت مندانہ رہا۔ انہوں نے دیوانگی اور نفرتوں کے خلاف متحد ہو کر آواز بلند کی اور ادب کو غیر انسانی اور داغ دار ہونے سے بچا لیا۔

دوسری جنگ کے خاتمے سے لے کر 47ء اور اس کے کئی سال بعد تک ہمارے شعرا اور ادباء نے جو کچھ لکھا وہ وہی تھا جو ان حالات میں وہ لکھ سکتے تھے یا لکھا جانا چاہئے تھا۔ البتہ بعض فقیہان ادب نے اس دور کے ادب کو اعصاب زدہ، ندلوجی اور غیر متوازن قرار دے کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ محمد حسن عسکری صاحب اور چند متفقین نے اسلامی ادب اور بعد میں پاکستان ادب کی تشریحات اور تفسیرات کے ذریعے سے اس دور کے ادب کو غیر ادب قرار دینے کی سعی بلیغ فرمائی۔ یہ فکری رجحان منطقی طور پر اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا آج وہاں پہنچ گیا ہے۔ جہاں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم و مغفور کے حوالے سے ادب و شعر کو پڑھنے اور ذوق کو غالب پر ترجیح دینے کا جواز پیدا کیا جا رہا ہے اور کوئی تعجب نہیں جب کوئی دوسرا کشاف ادب اٹھ کر مولانا فرمان علی مرحوم و مغفور کے حوالے سے تعشق کو مومن پر ترجیح دینے کی کوشش کرے۔ ایک بات یہاں یاد رہے کہ 47ء اور اس کے چند برسوں بعد تک ادبی مباحث کو مستند

ثابت کرنے کے لئے غیر اخلاقی اخلاقیات کے شارح اندرے ژید اور ازمنہ وسطیٰ کے دل دادہ] کیتھولک مسلک اور شاہ پرست ہوئی۔ ایس ایلیٹ کے ارشادات عالیہ کو شد و مد سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ (سارتر' کا فکار رکئے' پال دلیری اور کاموو غیر ہم بعد میں کام آئے) ان حاملان شریعت ادب سے پوچھنے کی بات یہ تھی کہ ہمارے شعراء اور ادبا نے فسادات کو ادب کا موضوع بنا کر کون سا ارتکاب گناہ کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خون ریزی اچھی بات نہیں ہے تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ یا تھی اور ادبی وقار کو اس سے کیا صدمہ پہنچ سکتا ہے یا پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت جو کچھ بھی لکھا گیا۔ وہ اس بات کا بین ثبوت تھا کہ ادیب تفرقہ پرداز نہیں تھے۔ وہ ادب کو نہ کوئی فنی تجربہ سمجھتے تھے نہ نمائش ذات کا ذریعہ۔ وہ آدمی کو آدمی سمجھتے تھے اور اسے اپنے نفسیاتی مرض کی تشخیص اور تسکین کی خاطر نفسیاتی نظریات کا تختہ مشق نہیں بنا رہے تھے۔ ادب ان کے لئے نہ کوئی جھوٹی چیز تھا نہ چھوٹی چیز۔ وہ ادب کو زندگی کی طرح بابرکت اور ہر جہتی سمجھتے تھے۔ افسانے' ڈرامے' ناولیں' نظمیں' غزلیں یہاں تک کہ تنقیدیں سب ایک مشترک انسانی احساس اور اقدار کی ترجمان تھیں۔ زندگی کی کلیت اور ادب کی کلیت میں کوئی افتراق اور تصادم نہیں تھا۔ یہ افتراق اور تصادم تو اس وقت رونما ہوتا ہے جب لکھنے والے کے پاس صرف ہیتی تجربات اور کتابی نظریات رہ جاتے ہیں اور وہ اپنے کو بڑا اور زندگی کو چھوٹا سمجھنے لگتا ہے۔ مغربی ادیبوں کے حوالوں اور نام گنانے اور علمائے نفسیات کے ذریعے سے معاشرتی ارتقاء اور تغیرات کی تشریح اور ذہنوں کے رسا یا نارسا ہونے کی تعبیرات پیش کرنے ہی سے اگر کوئی معتبر شاعر و ادیب بن سکتا تو آج ہمارے یہاں اس نوع کے ادباء اور شعراء کی ایک لمبی فہرست ہوتی۔ (یہ لمبی فہرست آج ملتی ضرور ہے مگر یہ اس قدر گروہ در گروہ اور نسل در نسل ہے کہ ادب کچھ قبائلی اور نسلی رجحانات کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ ممکن ہے غار والے آدمی کی تلاش میں ایسے مراحل سے گزرنا لازمی ہو) اس میں شک نہیں کہ عالمی ادبی تحریکوں سے باخبری ادب کو بصیرت' وسعت اور توانائی دیتی ہے لیکن یہ باخبری اگر عالمی سیاسی اور معاشی تحریکات کی نفی سے مرتب ہو تو یہ بہت جلد نفسیاتی الجھنوں میں بدل جاتی ہے۔ احساس کمتری کے مارے ہوئے یہ شاعر اور ادیب ہر دو تین سال بعد رخصت ہو جاتے ہیں۔ اساطیر کا سہارا لینے' توراۃ اور انجیل کی زبان کو اپنانے اور جوائس سے فیض اٹھانے کے باوجود ایسے لکھنے والوں کے یہاں ادب صرف لباس بن جاتا ہے اور فینسی ڈریس کی پریڈ سے آگے نہیں بڑھتا۔ اجتماعی تاریخی شعور سے کٹ کر لکھنے والا انفرادی لاشعور کی نذر ہو جاتا ہے۔

47ء سے پہلے اور اس کے بعد کے لکھنے والے نظریات اور مزاج کے اختلافات کے باوجود بالعموم اپنے معاشرے ہی کو ادب کے لئے فیضان سمجھتے تھے۔ اسی لئے جہاں جگر کی غزلیں اس موڑ پر پہنچ چکی تھیں

شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

☆

کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

وہاں ساحر بھی پوچھ رہے تھے "مگر اس عالم وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری" اس میں قدیم اور جدید کی تقسیم اور تخصیص نہیں تھی۔ ادب قدیم اور جدید میں تو تقسیم ہوتا ہی رہتا ہے مگر یہ تقسیم ادبی تاریخ کے ارتقاء کو پیش نظر رکھ کر ہوتی آئی ہے۔ ارتقائی کڑیوں کو توڑ کر اور ادبی تسلسل اور معاشی رجحان کی نفی کر کے کسی ایسے جدید کا تصور محال ہے جو صرف اپنی آواز پر زندہ رہے۔ اردو غزل عہد بہ عہد معاشرتی تغیرات کو اپناتی ہوئی آگے بڑھی ہے۔ سودا نے جب یہ لکھا تھا

فکرِ معاش، عشقِ بتاں یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

تو انہوں نے کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں کے سہارے زندگی بسر کرنے والے شاعر کے منہ سے بات اچک نہیں لی تھی۔ معاشرتی تغیرات لب و لہجے کو مختلف موڑ، معنویت اور بدلی ہوئی اہمیت دیتے رہتے ہیں۔ فراق کی غزلوں تک پہنچتے پہنچتے خرام ناز سے حشر اٹھانے والا حسن "برہنہ پا" ہو چکا تھا اور حیات کی کڑی منزلوں میں ناز و نیاز کا فرق مٹ چلا تھا۔ فراق کی غزلوں کا تاریخی شعور ان کے عہد کی دین ہے

رُکی رُکی سی شب ہجر ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو ان کی رہ گزر آئی

☆

دیکھ رفتار، انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

تاریخ کے اس بڑے تغیر کو سمجھنا جس کے پیچھے معاشی اور سیاسی عوامل کارفرما ہیں۔ نظم نگاری نہیں۔ غزل گو شعراء کے حق میں بھی فال نیک ہے۔ فراق کی غزلیں ان معنوں میں جدید نہیں ہیں کہ وہ تاریخی تسلسل کی نفی کرتی ہیں بلکہ اس لئے جدید ہیں کہ وہ اس تسلسل اور تغیر کا اعتراف ہیں۔ اس کے بغیر ان کے یا کسی دوسرے شاعر کے یہاں ہر قسم کی معنویت کی تلاش بے سود ہو جاتی ہے۔

اردو غزل میں معاشرتی اور سیاسی تغیرات کا عکس 45ء سے بہت پہلے ہی پڑنا شروع ہو چکا تھا۔ حسرت، یگانہ، فانی، اصغر، جگر سب کے یہاں مختلف پیرائے اور مختلف انداز فکر کے مطابق ان تغیرات کے اثرات ملتے ہیں۔ پھر اقبال کو بھی نہ بھولئے جن کے فکری لہجے نے غزل کو آفاق گیر بنایا اور مسائل حیات کو اپنانے کی جرأت اور توفیق عطا کی۔ ان شعراء کی غزلوں سے بحث یہاں مقصود نہیں۔ صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ نظموں کے بھرپور تسلط کے دور میں بھی جب اقبال اور جوش اور ان کے بعد آنے والے نئے نظم نگار پورے ملک کی فکر، جذبے اور تمنا کے ترجمان بن گئے تھے۔ غزل کی آواز ان شعراء کی بدولت دب نہ سکی۔ ہماری شاعری میں غزل کا یہ دور کسی بھی گزشتہ دور کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم معتبر اور کم اہم نہیں ہے۔ بلکہ بعض معنوں میں اس دور نے مجموعی طور پر غزل کو جتنی سمتیں اور اس کے لہجے کو معنویت کے جتنے رخ دیئے اتنا کسی اور دور میں ممکن نہیں ہوا تھا۔ اتنی ستھری، دل آگاہ، ہموار اور زندہ فضا کسی اور دور میں نہیں پائی جاتی ان شعراء کے ساتھ ساتھ صفی، آرزو اور محشر کا کام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً آرزو کے یہاں تو غزل اس بادل کی طرح اٹھی ہے۔ جس کے برستے ہی زمین سے سوندھی سوندھی مہک آنے لگتی ہے۔

ان شعراء کے سامنے ہی اردو شاعری میں نئی آوازوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ نئے شاعر تھے جو بالعموم نظم نگار تھے اور زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی غزلیں اور اچھی غزلیں کہہ لیا کرتے تھے۔ مجاز نے بھی غزلیں کہیں اور جذبی نے بھی غزلیں کہیں مگر یہ صرف اور محض غزل گو نہیں تھے۔ مجاز کے مقابلے میں جذبی کے لہجے کی تھکن اور افسردگی غزل کے مزاج سے زیادہ قریب تھی اسی لئے وہ غزل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مجاز کے لہجے کی کشادگی اور اس کا وفور شوق نظم کی مربوط فکری اور وسیع المشربی کا حامل تھا۔ پھر بھی ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ مجاز نے جتنی بھی غزلیں کہی ہیں اس میں شورش دوراں اور صورت جاناں بیک وقت پائی جاتی ہے۔ فراق کی نئی غزلوں کی شروعات کا بھی یہی دور ہے اور

مجاز نے فراق کے ساتھ ساتھ ہی غزل کے لہجے کو تلخیِ حیات سے آشنا کیا۔ فیض بھی اسی زمانے سے غزلیں کہہ رہے ہیں مگر اس عہد کی غزلوں میں ابھی وہ فیض نہیں تھے جو بعد میں ہمیں دست صبا میں ملتے ہیں۔ بہر حال مجاز، جذبی اور دوسرے نظم نگار شعرا نے غزلوں کی طرف توجہ ضرور دی مگر یہ خالص غزل گو شاعر کی حیثیت سے نہ ممتاز ہو سکے اور نہ اس کا امکان تھا۔ ان کی شاعری کی پشت پر ان کی نظمیں بھی تھیں یہ غزلیں ان کی نظموں سے ہٹ کر کوئی الگ سی چیز نہیں تھیں۔ وہ ان کی شاعری کے سڈول جسم کا ایک حصہ تھیں اسی لئے ان شعراء کی غزلوں مین اپنے عہد کے کسی بڑے غزل گو شاعر کا اولاً تو کوئی اثر نہیں ملتا اور اگر کہیں کہیں اور کبھی کبھی ملتا بھی ہے تو متعین اور نمایاں نہیں ہے۔ ان کی غزلوں کا وہی انداز ہے جو ان کی نظموں کا ہے یہی فیض کی اس دور کی غزلوں کا حال ہے جن کا سلسلہ اصل میں دستِ صبا سے شروع ہوتا ہے۔ فیض کی غزل کا حسن اس کا درد مجبوری، اس کی خواب ناکی آدمی کے لئے اس کا پیار اور دل سوزی ان کی نظموں کی فضا ہی کی پروردہ ہے

درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

فیض کی غزل کا یہ مصرعہ اور ان کی نظم کا یہ مصرعہ

چاندنی رات کا بیکار دہکتا ہوا درد

ایک ہی آواز کا جادو رکھتا ہے۔ یہی حال بالعموم ان تمام نظم نگار شعراء کا ہے جنہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ عزیز حامد مدنی کی نظموں اور غزلوں دونوں میں وہی ایک لہجہ پایا جاتا ہے جو فکر اور جذبے کے درمیان سفر کرتا ہوا نئی عصری معنویت کی تلاش میں نکلا ہے یہ لہجہ رمز آشنا اور رمز نما دونوں ہے۔ ظہور نظر، احمد فراز اور دوسرے نظم نگار شعراء کے یہاں بھی یہی اکائی ملے گی۔ ان تمام نظم نگاروں کے یہاں (خواہ مجاز کے دور کے ہوں یا اس دور کے) کسی پیش رو غزل گو شاعر کی چھاپ اس طرح نہ ملے گی جس طرح 47ء کے بعد کے غزل گو شعراء کے یہاں عام طور سے پائی جاتی ہے۔ نظم نگار شعراء کی شاعری چھوٹی بڑی جیسی بھی ہو ان کے اپنے رنگ کی شاعری ہے۔ یہ میر، غالب، مومن، آتش، یا حسرت، فانی، یگانہ، جگر اور فراق کے رنگ کی شاعری نہیں ہے۔ اردو شاعری کی روایات کے ارتقائی سلسلے اور عصری میلانات کے امتزاج اور اثرات تو ان کے یہاں تلاش کئے جا سکتے ہیں لیکن ان اثرات کو صرف ان کی غزلوں تک مخصوص اور محدود قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بہر حال بات ہو رہی تھی مجاز اور دوسرے نظم نگار شعراء کی جنھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ یہ تمام شعراء نظموں کی وجہ سے معتبر ہوئے ہیں۔ غزلوں کی وجہ سے نہیں۔ فیض، احمد ندیم قاسمی، جاں نثار اختر، سردار جعفری سے ان کی نظمیں لے لیجئے پھر سوچئے ان میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ان کے بعد جس نئے شاعر نے واقعی صرف غزلوں کی بناء پر اپنی آواز پہنچوائی وہ مجروح ہیں۔ نظمیں مجروح نے بھی شروع میں کہی تھیں مگر جلد ہی انہوں نے غزل کو اپنے خیالات اور جذبات کی ترسیل کے لئے اپنا لیا۔ ان کے عہد مین ہر چند اردو کے کئی بڑے غزل گو شعراء موجود تھے مگر مجروح کے یہاں ان میں سے کسی بھی شاعر کا قطعیت کے ساتھ کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ جگر کے شعری مزاج سے قربت کے باوجود وہ جگر کے رنگ سے اس لئے ہٹ گئے کہ انہوں نے صراحت اور باقاعدگی کے ساتھ عہد جدید کی سیاسی بصیرت کو اپنی غزلوں میں راہ دی۔ ان کی زبان کی پختگی غزل کی روایات کو اپنانے کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے پختہ شعور کو اپنانے سے گریز اں نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں آج بھی کچھ کہنے سننے پر آمادہ نظر آتی ہیں۔ ان میں خود ہی کہنے اور خود ہی سننے کا وہ انداز نہیں پایا جاتا جو بیشتر جدید تر غزل گو شعراء کا طرہ امتیاز ہے۔

47ء کے بعد غزل گو شعراء کی نئی پود بھی اپنے زمانے کے رجحانات سے منحرف نہیں ہوئی۔ ناصر کاظمی اور سلیم احمد دونوں اپنے گرد وپیش سے متاثر ہیں۔ ناصر کاظمی نے معاشرتی بے مہری اور اپنی تنہائی کو درد عشق میں ڈھال کر غزل کو اداس چاندنی رات میں مہکتے ہوئے پھولوں کی بھینی خوشبو دی۔ سلیم احمد نے پہلے تو غم عشق کو اپنایا مگر بعد میں ان کے معاشرے کی پستی نے ان میں ایک ایسا منتقمانہ جذبہ پیدا کر دیا کہ حسن و عشق دونوں ان کے طنزیہ لہجے کا ہدف بن گئے اور ان کا پختہ اور غزل شناس لہجہ، خود غزل کا حریف بن گیا۔ ادھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھر غم عشق کی تلاش میں ہیں مگر گم عشق تلاش سے شاید نہیں ملتا۔ ناصر کاظمی کی شاعری اپنا جذباتی خلوص پر اعتبار کھو کر استادی کی طرف زیادہ مائل ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی غزلوں کا چاند اس میں شک نہیں کہ دوسرے شعراء کے یہاں کبھی کبھی چمکتا نظر آجاتا ہے۔ مگر خود ان کے یہاں ڈوب گیا ہے۔

استادی کی بات آ ہی گئی ہے تو نئی غزلوں میں ایک اور رجحان کو بھی دیکھتے چلئے۔ جدید تر غزل گو شعراء اپنے تمام تجرباتی لہجے، روایت شکنی اور خودنمائی سے زیادہ خود فروشی (تجارتی اور اشتہاری دور کا یہ اثر بھی دیدنی ہے) کے باوجود استادی کے چکر میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہ استادی ان کے یہاں کئی طرح سے نظر

آتی ہے کبھی ان کی غزلوں میں شاہ نصیر اور ناسخ کی روح کارفرما ملتی ہے۔ ایک صاحب کی غزل اس مطلع سے شروع ہوتی ہے

دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے بھاری پتھر
مارنے آئے ہیں عیسیٰ کو حواری پتھر

دوسرے صاحب کا مطلع ملاحظہ فرمائیے

عمر کو کرتی ہیں پامال برابر یادیں
مرنے دیتی ہیں نہ جینے یہ ستمگر یادیں

تیسرے صاحب کا مطلع بھی دیکھتے چلیے

دہنِ مہمان میں کانٹے
پہلوئے میزبان میں کانٹے

کبھی یہ استادی میر، مصحفی اور آتش کے یہاں سے چند مخصوص اسالیب اور الفاظ کو اپنا کر اپنے جدید ذہن کو قدیم ذہن سے وابستہ کر کے اپنی غزلوں کو فریز رکی ''شاخ زریں'' بنانا چاہتی ہے۔ اس قبیل کے شعراء کے یہاں خوشبو، رنگ حنا، چشم زخم اور پتھر وغیرہ قسم کے الفاظ بار بار آتے ہیں۔ بلکہ وہ ان شعراء کی غزل میں کلیدی علامت کا درجہ رکھتے ہیں، بعض شعرا نے جدید تغیرات کو قدیم تلمیحات کے ذریعے سے پیش کر کے استادی کا یہ کمال دکھایا ہے۔ تلمیح اور لطف زبان کا یہ نادر نمونہ دیکھئے

لیلیٰ سر بگریباں ہے مجنوں سا عاشق زار کہاں
ہیر دہائی دیتی ہے، رانجھے سا یار غار کہاں

لگے ہاتھوں قادر الکلامی کا یہ نمونہ بھی دیکھئے کچھ کم دلچسپ نہیں ہے

چر گئی ککڑی، ککڑ مکڑی تھی یا مکڑ
بھولی تھی صورت سے، اندر سے تھی پکڑ
اڑے دلوں کے پرزے رات چلا وہ جھکڑ

جدید تر غزل گو شعراء میں اس نوع کی استادی عام ہوتی جارہی ہے۔ اپنے کلاسیکی ادب سے وابستگی اور باخبری ہر چند تقویت بخش ہے مگر ایسی بھی تقویت کیا جو غزلوں کی فکری، جذباتی اور لفظی ساری قوت چھین لے۔

خیر یہ تو ہوئی استادی کی بات اب پھر 47ء کے بعد غزل کہنے والوں کی طرف آیئے۔ یہاں ایک اور بنیادی بات یاد رہے۔ آرزو، حسرت، جگر، یگانہ ابھی زندہ تھے۔ (فراق بحمدللہ اب بھی ہم میں ہیں) یہ اردو غزل کی بڑی آوازیں ہیں۔ ان میں تین شاعر ایسے ہیں جو خود اپنی جگہ ایک اسکول بن گئے۔ جگر اسکول، یگانہ اسکول اور فراق اسکول (یوں ایک اسکول روایتی غزل کہنے والوں کا اب بھی بڑے حوصلے، سلیقے اور احتیاط کے ساتھ لکھ رہا ہے) نئے غزل گو کم وبیش ان تین شعراء سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہیں۔ یہاں تک کہ حفیظ ہوشیار پوری جو 47ء سے پہلے ہی سامنے آچکے تھے فراق اسکول ہی کی ایک آواز معلوم ہوتے ہیں۔ جگر، یگانہ اور فراق نے ہماری نئی غزل گوئی پر دوررس اثرات چھوڑے ہیں (اس دور میں فیض اور ندیم کی غزلوں کے اثرات بھی نئی نسل قبول کر رہی ہے) جگر کی آواز ہمیں کئی نئے غزل گو شعراء کے یہاں مل جاتی ہے۔ خمار بارہ بنکوی کو تو جانے دیجئے وہ تو جگر کا چربہ ہی ہیں اگر ناصر کاظمی کی غزل کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں جگر وہاں بھی مل جائیں گے۔ ناصر کاظمی یوں تو بنیادی طور پر میر اور فراق سے متاثر ہیں مگر ان کی غزل کی رومانی فضا اور جذباتی رنگ آمیزی جگر کی غزلوں سے بیگانہ نظر نہیں آتی۔ مگر جگر کی آواز زیادہ دور تک غزل کا ساتھ نہیں دے سکی۔ ہجر کی لذتوں میں ڈوبی ہوئی یہ آواز جو ناز حسن سے زیادہ عشق کی وارفتگی کی ترجمان تھی جگر کی شخصیت تھی۔ ان کے بعد یہ آواز کسی اور کے منہ پر کھل نہ سکی۔ اس آواز نے غزل کو عشق کی سرشاری دی ہے۔ یگانہ نے غزل کو زمانے کا اونچ نیچ سکھایا۔ لفظوں کی قوت کا ادراک اور سرد و گرم کو جھیل جانے کا حوصلہ دیا۔ ان کی بے لاگ، بے رحم تنقیدی فکر، غزل کو معاشرتی ربط سے آگاہ کر گئی۔ فراق نے غزل کو تہذیب جنس سے آشنا کیا۔ اب تک اردو غزل میں صرف عشق معتبر تھا۔ جنس اور لگاوٹ کی شاعری کو معاملہ بندی قرار دے کر ذرا فروتر سمجھا جاتا رہا ہے۔ فراق نے اسے جنسی طہارت دے کر ابھارا اور عشقیہ بلندی دی۔ ان کے یہاں عشق زندگی کا ایک قوی محرک ہے۔ جو حسن پر بھی فدا ہے، سیاسی تغیرات پر بھی نظر رکھتا ہے اور اپنے جذباتی خلفشار کو معاشرتی خلفشار سے الگ رکھ کر نہیں بلکہ اس کے ساتھ منسلک کر کے سمجھنا اور سلجھانا چاہتا ہے۔ اسی لئے فراق کی غزل فرد اور معاشرے کے ربط اور تصادم کی بیک وقت مظہر بن جاتی ہے اور اس میں متضاد کیفیات قربت اور جدائی کی داستان سناتی ہوئی ملتی ہیں۔

یگانہ اور فراق کی آواز کسی نہ کسی پیرائے میں اردو کے تمام نئے غزل کہنے والوں کے یہاں مل جائے گی۔ ناصر کاظمی کے یہاں ان اثرات کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ سلیم احمد کے یہاں بھی یہ اثرات ہیں۔ ان کی

غزلوں میں فراق اور یگانہ بلکہ کبھی کبھی حسرت بھی مل جائیں گے اوپر جو "کگز" اور "مکڑ" والا شاہکار آپ دیکھ چکے ہیں وہ بھی یگانہ اور فراق دونوں کی بگڑی ہوئی شکل ہے

کون دیتا ہے ساتھ مردوں کا
حوصلہ ہے تو باندھ ٹانگ میں ٹانگ

☆

دل کی دھڑکن دے نہ سنائی
کان میں اتنا تیل نہ ڈال

(فراق)

جدید اور جدید تر غزل گو سب انہیں دو آوازوں کے سائے میں پل رہے ہیں۔ چند اشعار ادھر ادھر سے سنتے چلئے اور دیکھئے کہ یگانہ اور فراق کہاں کہاں سے اور کس طرح نمایاں ہیں۔

مٹتی نہیں کسی سے بھی قربت کی دوریاں
گر کھو گیا ہو تو تجھے ڈھونڈ لائیں ہم

☆

بس ایک بار کسی نے گلے لگایا تھا
پھر اس کے بعد نہ میں تھا نہ میرا سایہ تھا

☆

وہ اجنبی بھی نہیں میرا آشنا بھی نہیں
وہ میرے پاس نہیں ہے مگر جدا بھی نہیں

یہ تین مختلف شعراء کے اشعار ہیں مگر ان تینوں اشعار میں اجتماع ضدین کا وہ کرتب مل جائے گا جو فراق کی غزلوں میں ایک کائناتی تحیر بن کر ابھرا تھا۔

یگانہ کے اثرات بھی کچھ کم نہیں پائے جاتے۔ مشتے نمونہ از خروارے

اتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا
زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

☆

بے پر کی کی کوئی بات نہیں چاہئے مجھ کو

تقریر مساوات نہیں چاہئے مجھ کو

☆

میں عجب دیکھنے والا ہوں کہ اندھا کہلاؤں

وہ عجب خاک کا پتلا تھا کہ نوری نکلا

یہ بھی تین مختلف شعراء کے اشعار ہیں مگر ہر شعر میں یگانہ موجود ہیں۔ ناؤ' کنارا' زمین کا چلنا بے پر کی بات۔ تقریر مساوات' خاک کے پتلے کو دیکھ کر اندھا کہلانا۔ یہ سب یگانہ ہی کا فیض ہے۔

ہمارے جدید غزل گو شعراء کے یہاں یگانہ اور فراق دو نمایاں رجحان بن گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اتنے اثرات ان شعراء نے کیوں قبول کئے۔ اپنے سے بڑے شاعر کا اثر قبول کرنا کوئی نئی بات ہے اور نہ بری بات لیکن انہیں اثرات کا پابند ہو کر رہ جانا قد کر بڑھنے نہیں دیتا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ جدید غزل لکھنے والوں کی ذہنی پیچیدگیاں اور معاشرے کی سفاکی انہیں فراق اور یگانہ تک پہنچاتی ہے مگر ان کا دور فراق اور یگانہ کے دور سے کہیں آگے بڑھ چکا ہے۔ اس دور میں وہ آدمی جو پہلے برصغیر میں برطانوی حکومت کے خلاف نبرد آزما تھا اب اس عالمی جدوجہد میں شریک ہو چکا ہے جس نے اس کی تنہائیوں کو کہیں زیادہ کم کر دیا ہے اور آج وہ ایک اجتماعی عزم کا مظہر بن گیا ہے۔ حبیب جالب اگرچہ نرے غزل گو نہیں ہیں مگر انہوں نے اس پہلو کی طرف واضح اشارے کئے ہیں۔

غالبؔ و یگانہؔ سے لوگ بھی تھے جب تنہا

ہم سے طے نہ ہو گی کیا منزل ادب تنہا

اس سوال کا جواب بھی ان کے یہاں ہے

ہم سادہ دلوں پر یہ شب غم کا تسلط

مایوس نہ ہو اور کوئی دم ہے مری جاں

یہ نہ فراق کی آواز ہے نہ یگانہ کی۔ یہ حبیب جالب کی آواز ہے جو نہ اپنے درد کو جھٹلاتی ہے اور نہ آدمی کی کامیاب جدوجہد کو جھٹلاتی ہے۔ بیشتر جدید غزل گو زمانے سے زیادہ خود کو اہم سمجھتے ہیں۔ ان میں

بیزاری، کلبیت اور نفسیاتی الجھنوں کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ وہ اپنی ذات کی تلاش میں اس قدر سرگردان ہیں کہ ان کے یہاں حسن کا احساس بھی مردہ ہو چکا ہے۔ وہ اپنی تنہائی، افسردگی اور جنسی تشنگی پر عاشق ہیں۔ ان کی غزلوں میں محبوب کا کوئی چہرہ بمشکل ہی دکھائی دیتا ہے۔ یوں وہ دریچوں کو دیکھتے ہیں۔ بڑے شہر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے کے باوجود معاشقے کی تلاش میں سڑکوں پر پھرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں دھوپ، درخت، دریچے، شہر، ویرانے اور سمندر بار بار دکھائی دیتے ہیں مگر محبوب اس کی ادائیں اس کی زلفیں۔ اس کے لب ورخسار اس کی گفتگو سے ان کی شاعری بے گانہ ہے۔ ناصر کاظمی تک تو یہ عشقیہ شاعری چلتی رہی مگر آگے چل کر یہ صرف انا کی تسکین اور محرومیوں کا ذکر بن جاتی ہے۔ اپنے غم کو غمِ کائنات کہہ دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ ان شعرا نے عشق کی جگہ ایک اور چیز ڈھونڈ نکالی ہے۔ وہ ہے جسم اور جسم میں دوڑتا ہوا لہو۔ یہ لہو ان کے یہاں عہد قدیم کے انسان کی جبلت، نسلی تسلسل اور شہوانی جذبے کا ابھار بن جاتا ہے۔ لہو کی پراسرار علامت مغربی ادب کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہے اور ہمارے نئے شعرا نے اسے کوئی بہت نئی علامت سمجھ کر جاو بے جا برتنا شروع کر دیا ہے۔

تلاش ذات کا یہ رجحان بھی فراق کی تیاگ اور بیراگ والی غزلوں سے جا ملتا ہے۔ البتہ فراق کے یہاں ذات اور کائنات کے ربط کی تلاش ہے۔ ان شعراء کے یہاں ذات یا تو ایک مابعد الطبیعاتی تصور ہے یا ایک ایسی اندھیری کوٹھری ہے جس میں داخل ہو کر وہ نہ کوئی چیز دیکھ سکتے ہیں نہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے غزل کو کچھ تحیراتی اور کچھ واقعاتی لب ولہجہ دیا ہے لیکن یہ بڑا نجی اور شکست خوردہ لب ولہجہ ہے۔ ہمیں ان کی غزلیں پڑھ کر ان کی ذات سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ ان کی غزلیں عمومی نہیں خصوصی کیفیات رکھتی ہیں۔ اس لئے غزل کی وہ بہت بڑی قوت جسے ہم تعمیم کہتے ہیں ان شعراء کے ہاتھوں ختم ہوتی جا رہی ہے اور اشعار کے یاد رہ جانے والی کیفیت مٹتی جاتی ہے۔ حالانکہ غزل کی ایک بڑی فتح اس کے اشعار کا یاد رہ جانا ہے۔

جدید تر غزلوں میں ایک اور رجحان پایا جا رہا ہے۔ یہ نظموں سے قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ رجحان اپنی جگہ ناپسندیدہ نہیں ہے۔ ان غزلوں میں تغزل کی جگہ نثری سادگی کا حسن پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ غالباً غزل کی روایات سے بچنے کا ایک یہ راستہ بھی ہمارے ان شعراء نے تلاش کر لیا ہے۔ غزلوں میں اب بموں کے دھماکے ہو رہے ہیں اور سگریٹ نوشی بھی شروع ہو چکی ہے۔ غزل کے رسیا شاید اس پر

بدخط ہوں مگر ان تجربات سے بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جدید تر غزل گو غزل کے نئے امکانات کی تلاش میں اور اپنے پر آشوب دور میں غزل کو زندہ رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں لیکن اس موقع پر ایک بات دریافت طلب ہے کہ اگر غزل میں اس قسم کا کوئی مصرعہ آجائے

اب کسان گائیں گے ہل کے ساز پر نغمے

تو ہمارے یہی شعراء اس طرح کے مصرعوں کو بیرون غزل قرار دے کر مردود کیوں گردانتے ہیں؟ اپنے دور کی ابھرتی ہوئی قوتوں سے یہ بدگمانی کیوں؟ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ ہل یا بموں اور سگریٹ والے مصرعے غزل کی اس فضا میں کھپتے ہیں یا نہیں جو در و دیوار، بلبل وقفس، صیاد و آشیانے وغیرہ کو استعارے اور علامت کے قالب میں ڈھال کر انگیز کرتی رہی ہے بلکہ اہم سوال یہ ہے کہ ہم نئے امکانات کی تلاش میں کھیتوں اور کارخانوں تک کیوں نہ جائیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان کھیتوں سے اگنے اور کارخانوں سے تیار ہونے والا شعور ہمارے بیشتر نئے غزل گو شعراء کی فکری اساس سے ٹکراتا ہے۔ آخر یہ نئے غزل گو انسانوں سے خائف کیوں ہیں؟ انہیں بھری ہوئی بستیاں جنگل کیوں نظر آتیں جن میں بزعم خود وہ بن باس اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ غزل کو اپنی روح اور جسم کی نا آسودگی اور تنہائی دے سکتے ہیں اور بس مگر یہ نا آسودگی اور تنہائی بھی بکھری ہوئی ملتی ہے۔ کیونکہ آپ جب بھی ان نا آسودگیوں اور تنہائیوں کو یک جا کرنے اور انہیں ایک سلسلے میں جوڑنے کی کوشش کریں گے تو انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی زندگی کا تصور لامحالہ ابھرے گا اور یہ شعراء بالعموم اجتماعی زندگی کے تصور سے گھبراتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی غزلیں اگر ذہنی اور جذباتی انتشار کی پروردہ معلوم ہوں اور اس کے سوا ان میں کسی اور چیز کی گنجائش کم نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

عہدِ جدید کی وہ غزل جو حسرت، یگانہ، فانی، جگر اور فراق کے ساتھ ابھری تھی آج کس منزل میں ہے اور ہمارے جدید و جدید ترین غزل گو ان شعراء کے مقابلے میں کہاں کھڑے ہیں اس پر ہم سب کو سوچنا چاہئے۔ اس بات پر اس طرح سوچنے سے ہمیں یہ شاید معلوم ہو سکے کہ گزشتہ دس یا پندرہ سال میں غزل میں کتنا اور کس نوع کا کام ہوا ہے۔ یہ جدید اور جدید ترین غزل گو شعراء کو گھٹانے یا بڑھانے پسند یا ناپسند کرنے کی بات نہیں ہے۔ وہ ادب جس کے لئے ان شعرا نے دنیا تج دی، ان سے بڑی بے جگری اور صاف گوئی کا مطالبہ کرتا ہے اور نئے شعراء بڑی صاف گوئی اور بے باکی کے ساتھ اپنا محاسبہ کرنے کا دعویٰ

کرتے ہیں۔ ان کے دعووں کو غلط ماننے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی لیکن اتنی سی بات وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ڈھٹائی اور صاف گوئی اور صداقت نوازی اور صداقت شناسی میں بڑا فرق ہے۔ اس نوع کی نمائشیں مریضانہ ذہنیت کی غماز بن جاتی ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ نئے لکھنے والوں نے غزل کو ایک نئے کرب اور نفسیاتی الجھنوں سے آشنا کیا ہے۔ بعض شعراء کے یہاں جسم ایک نیا تصوف بنتا جا رہا ہے۔ ان شعراء نے غزل کی روایات اور موروثی علامات کو نئے انداز سے پیش کرنے اور برتنے کی جرأت دکھائی ہے۔ انہوں نے غزل کے لب و لہجے کو الٹ پلٹ کر کبھی توڑ کر، کبھی کھردرا بنا کر، کبھی مقامی رنگ دے کر غزل کو اپنے دور میں کھینچ لانے کی بڑی کوشش کی ہے۔ نئے لکھنے والوں میں یقیناً کچھ شعراء ایسے ہیں جو غزل کے صنفی مطالبات اور اسی کے ساتھ اپنے عہد کے مزاج اور تقاضوں سے بے خبر نہیں ہیں۔ انہوں نے اچھی غزلیں کہی ہیں۔ ادھر ادھر سے چند شعر دیکھتے چلیے

تیرے آنے کا انتظار رہا
عمر بھر موسم بہار رہا

مطلع ڈھلا ہوا، پختہ اور تغزل کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔ ایک اور شاعر کا یہ شعر دیکھیے

یوں تو بڑے خلوص سے دوست ہوئے ہیں ہم سفر
راہ میں ساتھ چھوڑ دیں ان سے بعید بھی نہیں

تنہائی طنز سے زیادہ غم بن گئی ہے۔ اسی سے ملتا جلتا ایک دوسرے شاعر کا یہ شعر دیکھیے جو نیا مزاج اور غزل کی روایت دونوں کو سموئے ہوئے ہے اور یہ بھی دیکھیے کہ لہجے نے انجان بن کر طنز کو کس خوب صورتی سے ابھارا ہے

ایک پتھر ادھر آیا ہے تو اس سوچ میں ہوں
میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے

اسی تنہائی کا ایک اور رخ ایک اور شاعر کے یہاں دیکھیے۔ یہ مکمل تنہائی ہے اور پراسرار آواز میں گفتگو کرتی ہے

ذہن کے تاریک گوشوں سے اٹھی تھی اک صدا
میں نے پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں

یہ آواز بھی سنتے چلیے۔ جبر جہاں سے نڈھال ہے مگر متجسس ہے

یہ رہائی کی تمنا کیا ہے

جب مرے پاؤں میں زنجیر نہیں؟

یہ مختلف شعراء کے اشعار ہیں جن میں نیا ذہن کارفرما ہے مگر یہ ذہن غزل کی لطافتوں کا منکر نہیں ہے۔ اس لئے یہ غزل کو پوسٹر یا اخباری کالم بنانا نہیں چاہتا۔ ایسے کئی اچھے غزل گو آپ کو مل جائیں گے مگر ان کی تخلیق ابھی کوئی نام بن کر نہیں ابھری۔ انہوں نے صرف چند اچھے شعر اور چند اچھی غزلیں کہی ہیں۔ یہ سرمایہ بہت ناکافی ہے۔ شاعری کیفیت کے ساتھ ساتھ کمیت کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ ان شعراء کی آواز میں ابھی وہ دم اور انفرادیت نہیں پیدا ہو پائی ہے جو غزل کی ہمہ گیری کا احساس دلاتی ہے۔

اصل میں نئے لکھنے والوں نے مجموعی طور پر نئی غزل کے لئے ایک فضا پیدا کر دی ہے۔ یہ فضا ان کے زخمی لہجوں اور نیم دائرے بناتی ہوئی آوازوں سے مل کر بنی ہے۔ ان کا لہجہ چائے کی ٹوٹی ہوئی پیالی کی طرح ہے جس میں سگریٹ کی گرد اور بجھے ہوئے نم سگریٹ پڑے ہوئے ہیں۔ نئی غزل کی اس فضا میں کٹتے ہوئے کنارے گرتے ہوئے کگارے اور ریل کی پٹریوں کی قینچیاں بدلنے کی آواز ہے مگر یہ صرف آواز ہے یہ آواز کون دے رہا ہے اور کون سن رہا ہے۔ یہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ ایک راز سربستہ ہے اور جدید غزل گو اس راز سربستہ کو کھولنے سے ترساں اور گریزاں دونوں ہیں۔ ممکن ہے۔ یہ راز اگر کھل جائے تو معلوم ہو کہ یہ صرف ان کی اپنی آواز تھی جسے کوئی ان کے سوا نہ سن رہا ہے نہ سننا چاہتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس راز سربستہ کی تلاش انہیں پھر معاشرتی عوامل کی طرف لے جائے جس سے بچنے اور نظر چرانے کے لئے وہ اس نوع کی غزلوں کی طرف آئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ ان کی ذات انہیں روشنی دیتی ہے اور نہ معاشرہ۔ وہ بڑے اندھیرے میں ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں آدمی کہیں کھو گیا ہے۔ وہ نہیں مل رہا ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ نئی غزل اب تک اپنے محبوب کو نہیں پا سکی مگر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ انتظار عشق کی فطرت اور غزل کی لذت ہے۔ یہ نیا آدمی یہ نیا محبوب ہماری غزل کو مل کر رہے گا۔ پھر اسے پیار کرنے اور دوسروں کو اپنا بنانے کا سلیقہ آ جائے گا۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین

کچھ نثری شاعری کے بارے میں

نثری شاعری اردو میں کیوں آئی؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ اس کے متعارف کرانے کا جواز کیا ہے؟ مغربی ادب و شعر کے حوالوں سے کس طرح اسے حق بجانب قرار دیا جاسکتا ہے اس کے موافقین اور مخالفین کے دلائل کیا ہیں۔ میں ان تمام امور پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ اس واسطے کہ بات گھوم پھر کے نظم معرا اور نظم آزاد کی آمد یا درآمد اور اس کے قبول کئے جانے تک پہنچ جائے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نثری شاعری آچکی ہے اور لکھی جارہی ہے۔ اس میں اور روایتی شاعری میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ یہ کہی نہیں جاتی۔ لکھی جاتی ہے۔ پرانی شاعری میں صنفی ہیئت مقرر ہے۔ جس میں افکار اور جذبات ڈھل جاتے یا ڈھال دیئے جاتے تھے۔ آزاد نظموں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ شکست بحور کے باوجود بحور اور قوافی موجود ہیں۔ متعینہ بحور یا اصناف میں کہنے کے لئے شاعر کو کوئی خاص کوشش نہیں کرنی پڑتی تھی۔

مدتوں کے تہذیبی اثرات، اردو شاعری کی مجموعی ترنیتی فضا، بحور اور قوافی کی گونجتی ہوئی آوازیں اور خود شاعر کے افکار اور جذبات کی بنیادی موسیقی اس کے اشاعر کو متعینہ اصناف اور بحور سے کسی خاص کاوش اور سعی کے بغیر ہم آہنگ کردیتی تھی۔ معاشرے کی تہذیبی اقدار اور شاعر کی فکر میں کوئی فصل نہیں تھا۔ ایک معاشرتی وحدت تھی۔ جو فکر، اسلوب و طریقہ اظہار کی کثرت اور اختلاف کے باوجود تاثرات کے انتشار کا باعث نہیں ہوتی تھی۔ اسی لئے شعری تخلیقات میں شدت کے ساتھ تکمیل کی تلاش کی جاتی تھی۔ دیکھا یہ جاتا تھا کہ شعر مکمل ہوا یا نہیں۔ شاعری پر بڑی کڑی نظر ہوتی تھی۔ اصناف کے تقاضے پورے ہوئے یا نہیں۔ شعر دولخت تو نہیں ہوا۔ قوافی درست ہیں یا نہیں، ردیف سے چسپاں ہوئے یا نہیں۔ ردیف اٹھ رہی ہے یا نہیں؟

اب اگر ان نکتہ چینیوں اور تقاضوں پر غور کریں گے تو ان کے پیچھے بجز معاشرتی ہم آہنگی کے اور کوئی تقاضا نہیں ملے گا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک خود معاشرہ دولخت نہیں ہوا تھا۔ جوں ہی

معاشرہ بکھرنے لگا آزاد اور حالی نے نئے نئے موضوعات کی تلاش شروع کردی۔ آورد اور آمد کا فرق واضح تر ہونے لگا۔ جے جمائے معاشرے میں تمام ترفنی توجہات کے باوصف اچھے شعر کی تعریف میں آمد کی اصطلاح بڑی معنویت رکھتی تھی۔ شعر میں آمد کا مسئلہ ہمارے قدما کا واہمہ نہیں ہے بلکہ کہنے والے اور پڑھنے والے کی ذہنی اور تہذیبی شعور کی ہم نوائی ہے۔ کوئی بھی آرٹ ہو اس کی تخلیق بہت محنت طلب چیز ہے مگر صرف محنت طلب نہیں ہے یہ تند و تیز موج پر کشتی کھینے کا مسئلہ ہے۔ موج کی تندہی برقرار رہے اور کشتی بھی ڈوبنے نہ پائے۔ یہ بڑی استادی کا کام ہے۔ تخلیقی موج پر فن کی کشتی کو چلانا شعر میں آرٹ اور وہ چیز جسے آمد کہتے ہیں دونوں کو برقرار رکھنا ہے۔ اس کی سب سے مکمل مثالیں میر تقی میر اور انیس کے یہاں مل جائیں گی مگر جہاں صرف کشتی چل رہی ہو اور موجیں غائب ہوں وہاں شاعری شعر گوئی کی تجارت اور مہارت بن جاتی ہے۔ ناسخ، شاہ نصیر اور ہمارے زمانے میں ن۔ م۔ راشد اور حضرت میراجی اس کی بین مثالیں ہیں۔ ایک کے یہاں پولی ٹیکنک کی شاعری ہے تو دوسرے کے یہاں اسی سالہ سنیاسی کا کلینک کھلا ہوا ہے۔ ان دونوں کا کلام بلاغت نظام پڑھ لیجئے۔ آپ کو آورد کی جملہ معنویت سمجھ میں آجائے گی۔ یہ دور جدید میں اسی طرح کے استاد ہیں جس طرح شاہ نصیر اور امانت وغیرہ ایک دوسرے انداز میں اپنے عہد میں مانے اور جانے جاتے تھے۔ اس ضمن میں ایک بات کی طرف توجہ ضروری ہے۔ صناعی اور آورد میں فرق ہے۔ اچھی صناعی اپنی جگہ خود تخلیقی حسن ہے۔ گلزار نسیم اس صناعی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

بہر حال 1857ء کے بعد قدیم معاشرتی اقدار کی بے حرمتی اور فرسودگی اور جدید اقدار کی جارحانہ یلغار نے معاشرتی شکست وریخت کے عمل کو تیز کردیا یہاں تک کہ ہمارے دور میں پہنچتے پہنچتے دو عالمی جنگوں نے آدمی سے حال کا چین، مستقبل کی امید اور ذہن کا سکون چھین لیا۔ اقبال اور جوش تمام تر جدید گفتاری کے باوجود معاشرتی اقدار سے بعض اوقات برگشتہ ضرور نظر آتے ہیں مگر بے خبر نہیں ہیں۔ یہ اردو شاعری کی بہترین اور بزرگ ترین روایات کے حامل ہیں مگر ان کے بعد صرف قدیم روایات پر مبنی شاعری چل نہ سکی۔ زندگی کی بے کیفی، بے ہمتی اور بے رسی نے ہمارے شعراء کو نئی اصطلاحات اور نئے فارم کو اختیار کرنے پر مائل ہی نہیں مجبور بھی کیا۔

چنانچہ نظم آزاد اور نظم معریٰ کے بعد نثری شاعری کی آمد یا آورد منطقی چیز تھی۔ اس پر چراغ پا یا حواس

باختہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ افسانوں کو دیکھ لیجئے اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ ان میں کردار اب نہیں ملیں گے۔ کردار کی تلاش البتہ ملے گی۔ بیشتر جدید افسانہ نگار اس راہ پر چلنے کی کوشش میں ہیں جو ابھی بنی نہیں ہے۔ یہ راہ اگر بن بھی گئی تو ان افسانہ نگاروں کو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ یہ کہاں جاتی ہے۔ اس کی غالباً انہیں پروا بھی نہیں۔ منزل کی نارسائی اس دور کا مقدر بن چکی ہے۔ لایعنیت بھی ایک معنویت رکھتی ہے۔ اس معنویت کو سنجیدگی سے تلاش کرنا اور سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ اس معنویت میں بڑی تلخی، تنہائی، بے تعلقی، بے یقینی، بے جہتی اور ''عدمیت'' ہے۔

ہمارے جدید ترین شعراء اور افسانہ نویس لایعنیت کی اس ہیبت ناک معنویت کو نہ سمجھ پائے ہیں نہ انگیز کر پائے ہیں۔ وہ نہ ہونے کے دکھ سے آشنا ہی نہیں ہیں۔ اپنی ذات کی پبلسٹی نے انہیں ''ہونے'' کی شدید حرص میں مبتلا کر دیا۔

ہماری نثری شاعری میں سب سے بڑی قباحت اور اس کے قائم بالذات ہونے میں رکاوٹ یہی ہے کہ اس کے لکھنے والے اپنی فکر اور جذبے کی شعوری کوشش کی نفی نہیں کر پائے ہیں۔ ورنہ یہ ''نہفتہ'' کو آشکارا کرنے میں بڑی ممد ہوتی ہے۔ یہ چھوٹے آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوٹی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب تک شعروادب میں اشتہاری یا صحافتی رنگ کم آیا تھا۔

ہمارے یہاں جو نثری شاعری لکھی جا رہی ہے وہ اپنا اشتہار بنتی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کے لکھنے والے ہی بے وقار اور غیر معتبر نہیں ہوئے بلکہ خود یہ شاعری بھی یہی کچھ ہو کر رہ گئی۔

روایت شکنی اچھی بات ہے یا بری بات ہے۔ اس سے مجھے بحث نہیں ہے۔ یہ ہوتی چلی آ رہی ہے۔ ہوتی رہے گی مگر روایت شکنی کے لئے ادیبوں اور شاعروں کے قدم کو ذرا بڑا ہونا چاہئے۔

نثری شاعری کو ابھی کوئی بڑے قد کا شاعر نہیں ملا ہے۔ اس طرح لکھنے والے بیشتر وہی شاعر ہیں جو ہر صنف میں طبع آزمائی کرنے کے بعد اس کی طرف رجوع ہوئے ہیں۔ یہ تمام حضرات ''شعر'' کہتے رہے ہیں۔ اب انہیں شعر لکھنے کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔

نثری شاعری کہنے کی چیز نہیں ہے۔ لکھنے کی چیز ہے۔ افسانہ کہا نہیں جاتا لکھا جاتا ہے۔ یہ شاعری بھی ایک نوع کی افسانوی کیفیت رکھتی ہے۔ بے ترتیب زندگی کی بے ترتیب کہانی لکھنے کے لئے از خود رفتگی کی ضرورت ہے تاکہ شعوری کوشش کی گرفت نظر نہ آئے۔

تمام ڈھانچوں اور تمام سانچوں کو توڑنے کے بعد از سر نو تلازموں' استعاروں اور علامتوں کی تلاش بڑی عجیب سی نظر آتی ہے۔ نہیں کا حرف لکھ دینا تو بہت آسان ہے مگر اس کی گونج کو سننا اور قلم بنا کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ یہ ایلیٹ کی نظم ویسٹ لینڈ سے آگے کی منزل ہے۔

نثری نظم اگر اپنے لکھے جانے کا جواز نہ بن سکی تو یہ افسوس ناک بات ہوگی۔ نثر میں شعریت اور شعریت میں نثریت کو محسوس اور پیدا کرنا تجربہ بھی ہے اور ہمارے دور کا اقتضا بھی۔ تمام متعینہ نظریات اور فارم سے انحراف کوئی بے معنی چیز نہیں ہے۔ عالمی سیاسی خلفشار اور اعصاب پر اس کا دباؤ' مسلسل جنگیں' قومیتوں' نسلوں اور ملکوں کے اختلاف اور افتراق پیدا کرتے ہوئے نعرے' اخلاقیات کے مجرب اور تیر بہدف نسخوں کی ناکامی' عقیدوں کی پامالی' تجارتی منڈیوں میں آفتابوں اور مہتابوں کی خرید و فروخت ذہن کو مفلوج اور لکیر کا فقیر بناتی ہوئی معاشی منصوبہ بندیاں۔ ان تمام چیزوں نے آدمی کے زندہ رہنے یا مر جانے کے سارے طریق' تدابیر اور تصورات کو لغو اور متروک بنا دیا ہے۔ ہیملٹ نے انتہائی کرب کے عالم میں سوچا یا پوچھا تھا To be or not to be آج یہ کرب اور یہ سوچ یہ سوال بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ایسی صورت میں نثری نظم سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے' مگر لے کون؟

That is the question?

☆...... کتابوں پر تبصرے کے لئے ہمیشہ کتابوں کے دو نسخے ارسال کریں۔

☆...... نگارشات کاغذ کے ایک طرف صاف صاف' سطور کے درمیان فاصلہ دے کر خوش خط لکھیں۔ فوٹو کاپی بھیجنے سے گریز کریں۔

☆...... ہر تخلیق کے نیچے مصنف/شاعر کے نام کے ساتھ مکمل پتہ نیز فون نمبر (اگر ہو) صاف صاف اردو اور انگریزی میں ہونا ضروری ہے۔

☆...... غیر طلبیدہ مضامین کی اشاعت کے لئے بار بار فون کر کے اپنا اور ادارے کا قیمتی وقت برباد نہ کریں۔

☆...... پرچے کا خریدار ہونا تخلیقات کے شائع ہونے کی ضمانت نہیں۔

☆...... ''خیال'' سے آپ کی رفاقت اور تعاون کے لئے ادارہ آپ کا شکر گزار ہے۔

ادارہ

پروفیسر مجتبیٰ حسین

آنکھیں ہتھیلیوں سے مل......

صہبا صاحب......تسلیم!

عجب اتفاق ہے جب آپ جوش نمبر نکال رہے تھے تو میں بیمار تھا اور خط ہی کے ذریعے سے میں نے جوش صاحب کے بارے میں مختصراً ایک مضمون آپ کو بھیج دیا تھا۔ اب جب آپ کا خط ملا تو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں کراچی میں ایک ماہ بیمار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ چلتے وقت آپ سے نہ مل سکا۔

اس وقت بھی میں نے لکھا تھا کہ جوش کی شاعری کا احاطہ مضامین سے ممکن نہیں۔ متعدد کتابوں کی ضرورت ہے جو جوش کی ہزار شیوۂ شاعری کی کچھ پرچھائیوں کو شاید پیش کرسکیں۔ ایسا شاعر اردو کیا دنیا کی کسی زبان میں اسی صدی نہیں کسی صدی میں بھی مشکل ہی سے ملے گا۔ کون سی صنف ہے جسے جوش نے کمال کے درجے تک نہیں پہنچایا ہے۔ کون سا موضوع، کون سی فکر، کون سا جذبہ، احساس جبلت زندگی کا کون سا ارتعاش ایسا ہے جو جوش کے یہاں شعر بن کر مجسم نہ بن گیا

عفریت، خبیث، دیواژ درشیطان
درویش، اقطاب، امام، مرسل، یزداں
گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف
یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں و طپاں

یہ جوش کا نرا دعویٰ نہیں ہے جس نے بھی اردو شاعری سمجھ کر پڑھی اور پھر جوش کے ساتھ زمین آسمان کی سیر کی ہے وہ اس کی صداقت سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہوگا۔ افسوس کہ ان امور پر اس خط میں تفصیل سے بات نہیں ہوسکتی۔ پھر آپ کے پاس وقت بھی بہت کم ہے۔ پندرہ مارچ تک آپ نے مضمون بھیج دینے کی قید لگا دی ہے اور حکم نامہ آپ کا مجھے دوسری مارچ 1982ء کو ملا۔ کتنی باتیں ہیں جو میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ دل چاہتا ہے ہم آپ اور کچھ سخن شناس بیٹھ جائیں اور جوش کی نظمیں پڑھیں۔ تنقید کے لئے نہیں۔ لطف کے لئے۔ سینہ کشادہ اور آنکھیں روشن کرنے کے لئے۔

تنقید کے لئے بہت سے اصطلاحی تنقید نگار پڑے ہیں جن کے یہاں فضولیات مابعد الطبیعات اور مابعد الطبیعات فضولیات میں ڈھلتی جارہی ہے۔ بعض حضرات جوش کے فکری تضاد پر گفتگو کرنے آتے ہیں۔ بعضوں کے یہاں وہ انقلابی نہیں رومانی شاعر ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو ان کی شاعری کو فکر کی آواز سے خالی اور الفاظ کی گونج سے مملو پاتے ہیں۔ کچھ جوش کے یہاں جاگیرداری ڈھونڈتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو اپنی قوت مدرکہ اور نباضی کی بناء پر حکم صادر فرماتے ہیں کہ فلاں دور تک جوش زندہ اور فلاں دور میں جوش مر گئے۔ یہ تمام ذی علم، ذی شعور، ذی فکر حضرات یہ چاہتے ہیں کہ جوش ویسے ہو جائیں جیسی ان کی خواہش ہے۔ یہ اردو شاعری کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ جوش ان باکمال حضرات کی خواہشات پر پورے نہیں اترتے:

تاچند یہ علم و فضل و تنقید کا ڈھول
ہر شخص پہ کھل چکا ہے اس ڈھول کا پول
از راہ نیاز کہہ رہا ہوں تم سے!
اب بھائی اتارو یہ ہمہ دانی کا خول

......

ثابت نہ کر اپنے کو یکے از جہاں
بستے کو بغل میں داب، پوتھی کو سنبھال
مجھ کو نہ سمجھا شعر و ادب کے نکتے
نافہم نہ بن، نمک سمندر میں نہ ڈال

جوش کے پیش نظر ناقدانِ کرام کبھی نہیں تھے اور یہ بہت بڑی بات ہے جسے بھی جوش سے قریبی ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے وہ اس بات کی گواہی دے گا کہ ان کی محفل میں کبھی بھی کسی ناقد یا اس کی کسی رائے کا ذکر اشارتاً، کنایتاً بھی نہیں آیا ہے۔ طائران مردہ خور کی پرواز عنقا کے بلند آشیانے تک کبھی نہ ہو سکی۔ جوش کے پیش نظر وہ آدمی تھا جو دنیا کی شاعری میں (اور جب میں دنیا کی شاعری کہہ رہا ہوں تو اس سے مراد آدمی کی فکری، تہذیبی اور عملی تاریخ ہے) کبھی موجد، کبھی مفکر، کبھی محقق، کبھی صوفی، کبھی عاشق، کبھی انقلابی بن کر ابھرا ہے۔ یہ آدمی کبھی چاند بن گیا ہے، کبھی سورج، کبھی لو، کبھی ٹھنڈی ہوا، کبھی دریا،

کبھی پہاڑ، کبھی وادی، کبھی گھٹا، کبھی سقراط، کبھی حسینؓ۔ یہ آدمی دنیا کی شاعری میں بکھرا پڑا تھا۔ جوش نے اس کو یک جا کر کے پہلی بار ایک مکمل آدمی بنا کر پیش کیا ہے۔

نورِ گیتی، مشعلِ افلاک، شمعِ انجمن
اک مجسم کج کلاہی، اک سراپا بانکپن
ناصرِ اوجِ نگاراں، ناظمِ ابروچمن
ناظرِ موجِ بہاراں، ناقدِ سروسمن
مدعائے آسمان و مقصدِ روئے زمیں
مرکزِ اضدادِ عالم، محورِ دنیا و دیں
شارحِ آیاتِ ہستی، شارعِ دینِ حیات
قاضیٔ شہرِ صفات و کاتبِ دیوانِ ذات

☆

اک زمیں پرور محقق، اک فلک پیما حکیم
ایک مقیاسِ تجلی، اک رصد گاہِ عظیم
آسماں کا داور و دارا، زمیں کا کج کلاہ
بر کا آقا، بحر کا مولا، فضا کا بادشاہ
عالمِ اسباب کی محرابِ اعظم کا چراغ
پیکرِ ارض و سما کے کاسۂ سر کا دماغ

معاذ اللہ! کوئی ٹھکانا ہے اس وقت کا اور صہبا صاحب یہ بھی دیکھئے کہ بغیر ''فعل'' لائے مصرعے پورے ہوتے چلے گئے ہیں۔ فن کی اس تکمیلی گرفت میں بھی جوش کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ بعض ضیق النفس میں مبتلا شعرو، اور نقاد جن کی سانس ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے اور جو جوش کی توانا گرم نفسی کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ فرماتے ہیں کہ جوش کی اس نوع کی نظموں سے کئی شعر خارج کر دیجئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ایک ہی بات کو کئی طرح دہراتے ہیں۔ ان بے چاروں نے کہیں سن اور پڑھ لیا ہے کہ نظم کو بتدریج ارتقاء کی طرف بڑھنا چاہئے۔ ارتقاء کے معنی وہ صرف کہانی یا موضوعاتی ارتقاء سمجھتے ہیں مگر ان

کی سمجھ میں یہ بات مشکل ہی سے آئے گی کہ جوش کے یہاں ایک موضوع سینکڑوں موضوع میں ڈھلتا جاتا ہے۔ ایک آدمی پوری کائنات سے ہم ربط ہوکر سامنے آتا ہے۔ انیس نے اسی ہر جہتی دیدہ وری کی طرف اشارہ کیا ہے

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ایک راگ کتنے چہروں میں ڈھلتا جاتا ہے۔

اس نکتے کو یہاں سمجھانے کی گنجائش نہیں ہے۔ آدمی کو تہ در تہ دیکھنا اور افق تا افق تلاش کرنا بڑی ہمت' جودت' ندرت اور قدرت کا کام ہے۔ حافظ کی زبان میں ان حضرات سے اتنا کہہ دینا کافی ہے

سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جاست

اس میں شک نہیں جوش کی کئی نظموں میں تکمیل کی کمی ہے مگر جوش نے صرف کئی نظمیں نہیں کہی ہیں۔ انہوں نے اتنی نظمیں کہی ہیں کہ جدید شعراء کا تمام شعری سرمایہ اگر یک جا کر دیا جائے تو بھی جوش کے شعری سرمائے سے نصف سے بھی کم ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ میر کے ضخیم دیوان میں آپ تلاش کیا کرتے ہیں؟

میں یہاں کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ وہ پھر کبھی ہوگی۔ میں محض اس زر خالص کا ذکر کر رہا ہوں جو اردو کا سب سے بڑا فیاض شاعر ہمیں دے گیا ہے۔ لفظ بیان اور حریت فکر کا اتنا سرمایہ اور کسی نے نہیں دیا۔ برصغیر کی زندہ تصویروں کا اتنا بڑا البم اردو' ہندی' بنگالی' سنسکرت کسی زبان کے شاعر سے ہمیں نہیں ملا۔ اس البم میں از فرش تا عرش سب کچھ ہے۔ نظریاتی' فکری' جمالیاتی' عشقیہ' منظریہ ساری شاعری پر جوش کی شاعری حاوی ہے۔

میں اس سلوک کا بھی کوئی ذکر نہیں کرنا چاہتا ہوں جو صاحبان اقتدار' شعراء' ادبا اور تنقید نگاروں کی طرف سے ان سے روا رکھا گیا۔ محمود غزنوی مر چکا' شاہنامہ زندہ ہے۔ جوش فنا کے شاعر نہیں ہیں بقا کے شاعر ہیں۔ شاہنامے پر جوش کی رباعی کے آخری دو مصرعے یاد آ گئے

اسلام کا شاہنامہ لکھنے والے

اسلام کو شاہی سے تعلق کیا ہے

جوش کی شاعری میں قدیم تو تیں سمٹ آئی ہیں۔ غالباً 1946ء کا ذکر ہے۔ میں بمبئی میں تھا۔ ایک صبح کو اخبار جو دیکھا تو طوفان آنے کی خبر تھی۔ میں نے سمندری طوفان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سنک جو سوار

ہوئی تو طوفان کی آمد دیکھنے چل پڑا اور میرین ڈرائیو پہنچ گیا۔ خیال تھا اگر کوئی خطرناک صورت ہوئی تو پاس حمید بٹ مرحوم کا فلیٹ ہے اس میں پناہ لے لوں گا۔ اسی فلیٹ پر صفدر میر سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ حمید بٹ بڑے روشن خیال اور دوست آدمی تھے۔ خیر میں ساحل پر پہنچ گیا۔ میرین ڈرائیو پر سنگین پشتوں کے ذریعے سمندر کو روکا گیا ہے۔ میں ساحل پر پہنچا ہی تھا کہ آسمان سیاہ پڑنے لگا اور پھر تیز ہوا چلنے لگی۔ پھر ہوا خوفناک آواز میں بولنے لگی اور سمندر کی پہاڑ ایسی لہریں سنگین پشتوں سے ٹکرا کر چنگھاڑنے لگیں اور مسلسل دھائیں دھائیں کی آواز گونجنے لگی۔ پورا سمندر آسمان سے مل کر گرجنے چمکنے اور کڑکنے لگا۔ موجیں دورویہ سڑکوں کو پار کر کے بوچھار کی شکل میں دور تک پھیلنے لگیں۔ میں نے بھاگ کر سونا محل کے پورٹیکو میں پناہ لی۔ اسی کی دوسری منزل پر حمید بٹ رہتے تھے۔ یہاں بھی پناہ نہیں تھی۔ میں پانی میں شرابور ہو چکا تھا۔ خیر طوفان نصف گھنٹے میں گزر گیا مگر سمندر کو میں نے جس بپھرے ہوئے عالم میں دیکھا اس کی تصویر آج بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ قدیم کے کسی عظیم الجثہ، ہیبت ناک جانور کو لوہے کے بہت بڑے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو اور وہ بار بار لوہے کے مضبوط سلاخوں پر وحشت کے عالم میں اپنا سر ٹکرا رہا ہو۔ میرین ڈرائیو کے پشتوں سے سمندر کی موجیں جب جلال کے عالم میں ٹکراتی تھیں تو عناصر کا رزمیہ نظر میں پھر جاتا تھا۔

جوش کی شاعری کا بھی یہی تاثر میرے ذہن میں ہے۔ قدیم قوتیں مصرعوں سے ٹکراتی ہیں اور کبھی ٹکرا کر پار نکل جاتی ہیں۔ پھر جب یہ طوفان گزر جاتا ہے تو آسمان دھلا ہوا زمین دھلی نظر آتی ہے اور غنچہ و شبنم کے بات کرنے کی آواز آنے لگتی ہے۔ بچے بونے لگتے ہیں، چڑیاں چہچہانے لگتی ہیں اور سبزہ لہکنے لگتا ہے

جب رات کو جھومتے ہیں بادل کالے
ظلمت میں تپکتے ہیں دلوں کے چھالے
قربان ترے اس وقت کی تاریکی میں
انگشت سحر سے دل کو چھونے والے

جوش کی آواز میں طوفان بھی ہے اور بانسری کی تان بھی ہے۔ ایسی آواز میں اب کون بولے گا؟

30 دسمبر 1981ء کی صبح کو ممتاز حسین، سحر انصاری، سحاب قزلباش اور میں، جوش صاحب سے ملنے گیا (گئے نہیں) اطلاع ہوئی اوپر کمرے میں جوش صاحب کو گاؤ تکیے سے لگا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ جوش صاحب پر

نظر پڑی دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ قوی ہیکل جوش صاحب گٹھری بن کر رہ گئے تھے۔ آنکھیں چپ تھیں، ہم لوگ چپ تھے۔ کمرہ چپ تھا۔ سحاب سے رہا نہ گیا۔ باہر نکل کر رونے لگیں۔ پھر آنکھیں پونچھتی ہوئی اندر آئیں۔ جوش صاحب آہستہ سے بولے:

''رو رہی ہو؟ ہاں یہی ہوتا ہے۔''

پھر میں نے حسب دستور جوش صاحب کو چھیڑنے کی کوشش کی۔ ان کے لب مسکرائے، پتلیوں میں روشنی آئی اور چہرے پر جوش صاحب پھر آ گئے۔ میرا سر اپنے شانے سے لگا کر آہستہ سے بولے۔

''تصویر لے لو''

میں نے کہا کہ کیمرہ نہیں ہے۔ پھر میں نے جوش صاحب کی وہ غزل چھیڑ دی جسے وہ جب پوری طرح طلوع ہو جاتے تھے تو بڑے پر کیف ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے

آنکھیں ہتھیلیوں سے مل نیند ہے چشم ناز میں

بھر دے حنا کا رنگ بھی دیدۂ نیم باز میں

میں نے جوش صاحب کے ترنم کی نقل کرتے ہوئے مصرع چھیڑا۔ جوش صاحب شروع ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ساتھ دینے لگے۔ لبوں پر، آنکھوں میں، چہرے پر طفلانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ جوش صاحب پھر واپس آ گئے تھے۔ (ہائے رام۔ اس غزل کے بعد وہ عجب انداز سے ہائے رام کہتے دس گیارہ بجے دن کا وقت تھا مگر کمرے میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ پھر بھی ایک حسن کے ساتھ

تھیں آخری کرن سے سب وادیاں سنہری

ہم رخصت ہو کر باہر آ گئے۔

22 فروری 1982ء کو اردو شاعری کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد بار بار مجھے یہ خیال کہ اس وقت جب ان کی آنکھیں آخری نیند سے بوجھل ہو کر بند ہو رہی تھیں اگر کوئی یہ مصرع چھیڑ دیتا

آنکھیں ہتھیلیوں سے مل نیند ہے چشم ناز میں

تو کیا ہوتا۔ ہائے رام تو کیا ہوتا۔

جوش صاحب مر گئے، کوئی چیز ختم نہیں ہوئی۔ کوئی دور ختم نہیں ہوا۔ شاعر اعظم (۱) کی شاعری کے ساتھ ہر چیز، ہر دور زندہ رہے گا۔

(3 مارچ 1982ء) ابھی چند لمحے پہلے یہ مضمون ختم کیا تھا کہ 8:30 بجے رات کی خبروں میں

بی بی سی نے استاذی فراق صاحب کی وفات کی خبر سنا دی

حیراں ہوں دل کو پیٹوں کہ روؤں جگر کو میں

جوش صاحب کے انتقال کی خبر سن کر فراق صاحب بچوں کی طرح بلک بلک کر روئے تھے۔ اب ان کی موت پر کون روئے گا۔ جوش صاحب تو ہیں نہیں۔ ان کے انتقال کے پورے دس دن بعد فراق صاحب بھی چل بسے۔ گویا وہ جوش صاحب کا یہ مصرع پڑھ رہے تھے

آیا یارانِ رفتہ آیا...... آیا

(۱) یہ خطاب دیا نرائن مدیر 'زمانہ' کانپور کا دیا ہوا ہے۔

مجتبیٰ حسین

مظہر امام تم ہی ہو؟

میں نے 1977ء میں کشمیر اور مظہر امام دونوں کو پہلی بار سری نگر میں دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں دونوں کو ہی جی بھر کے نہیں دیکھ پایا۔ کیونکہ مظہر امام کو اطمینان سے دیکھنے کی کوشش کرتا تو کشمیر کے حسین نظارے مجھے اپنی طرف بلاتے تھے اور کشمیر کے حسن میں کھو جاتا تو مظہر امام کی شخصیت مجھے اپنی طرف بلاتی تھی۔ لہٰذا میں نے اس کشمکش کا پرامن حل یہ نکالا کہ دن میں تو کشمیر کو دیکھتا تھا اور شاموں میں مظہر امام کے شربتِ دیدار سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ کشمیر میں رہتے رہتے مظہر امام خود بھی کشمیریوں کی طرح ہی ہو گئے تھے۔ وہی رنگ ڈھنگ، وہی طور طریقے بلکہ ناک نقشہ بھی وہی۔ ماشاء اللہ رنگ بھی بالکل کشمیریوں کا سا۔ شاید ان کے رخساروں پر کشمیری سیبوں کی لالی بھی نکھر آئی تھی مگر میں نے ان کے رخساروں میں کشمیری سیبوں کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ جہاں سیبوں کی اتنی افراط ہو وہاں میں ان کے رخساروں کے سیبوں کو لے کر کیا کرتا۔ ماشاء اللہ قد بھی انہوں نے چناروں کا سا پایا ہے۔ چنانچہ چار چنار کی سیر کے وقت ان کی موجودگی کی وجہ سے مجھے چار چناروں کی بجائے پورے پانچ چنار نظر آئے۔ غرض مظہر امام کشمیر اور کشمیریوں میں کچھ اتنے رچ بس گئے تھے کہ جب جب انہیں دیکھتا میرا یہ یقین پختہ ہو جاتا تھا کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ حصہ ہے۔ جن لوگوں نے اس وقت کے اٹوٹ مظہر امام کو کشمیر میں دیکھا ہے وہ میرے اس دعوے کی تصدیق کریں گے۔ یہ اور بات ہے کہ امتدادِ زمانہ کے باعث آج مجھے مظہر امام خود کشمیر کی موجودہ صورت حال کی طرح اور کشمیر کی صورت حال موجودہ مظہر امام کی طرح دکھائی دینے لگی ہے۔

بہر حال 1977ء میں پہلی بار تھوڑے سے مظہر امام اور تھوڑے سے کشمیر کو دیکھ کر واپس چلا آیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ عرصے بعد میں پھر سری نگر گیا تو معلوم ہوا کہ مظہر امام دربھنگہ گئے ہوئے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے دربھنگہ جیسی بستی بسائی ورنہ میں کشمیر کو جی بھر کے کہاں دیکھ پاتا۔ کسی نے بتایا کہ مظہر امام سری نگر سے نکلتے ہیں تو کہیں رکے بغیر سیدھے دربھنگہ چلے جاتے ہیں جو ان کا وطن مالوف ہے۔ سفر کے

معاملے میں فیض احمد فیض کا بھی یہی حال تھا کہ کوئے یار سے نکلتے تھے تو راہ میں کوئی مقام انہیں جچتا ہی نہیں تھا اور وہ سیدھے کوئے دار پہنچ کر ہی دم لیتے تھے لیکن سفر کی یہ نان اسٹاپ منزل فیض کی سیاسی مجبوری تھی کیونکہ وہ انقلابی تھے۔ کوئے یار سے نکل کر کوئے دار نہ جاتے تو لوگ کیا کہتے بلکہ راولپنڈی سازش نے تو بعد میں یہ ثابت بھی کیا کہ فیض تو اپنے طور پر کوئے یار کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن بدخواہوں نے انہیں زبردستی اٹھا کر کوئے دار تک پہنچا دیا تھا۔ بہر حال سفر کے معاملہ میں ہمارے مظہر امام اس بات کے قائل ہیں کہ ایک کوئے یار سے نکلتے ہیں تو دوسرے کوئے یار کی طرف چلے جاتے ہیں۔ یوں بھی دربھنگہ ان کے لئے کوئے یار کی حیثیت ہی رکھتا ہے کیونکہ اپنی نوجوانی تک کے ابتدائی دن انہوں نے وہیں گزارے تھے۔ پھر ہر آدمی کا اپنا ایک دربھنگہ ہوتا ہے بلکہ بعض لوگوں کا تو دربھنگہ' دردربھنگہ بھی ہوتا ہے۔

مظہر امام کا نام میں نے بچپن سے سنا ہے اور نوجوانی کے دنوں سے انہیں پڑھا بھی ہے اور اب جب کہ زندگی کی شام کے سائے بڑھنے لگے ہیں تو میں انہیں اپنے سے بہت قریب محسوس کرنے لگا ہوں کیونکہ جب سے وہ میوروہار میں اور میں اندر پرستھ ایکسٹینشن میں رہنے لگا ہوں تب سے سری نگر' دربھنگہ اور دہلی کے فاصلے سمٹ گئے ہیں اور میرے اور ان کے بیچ اب صرف ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ جب تک مجھے ان کی اس وضع کی ہمسائیگی میسر نہیں آئی تھی تب تک مجھے اڑوسی اور پڑوسی کا فرق بالکل معلوم نہیں تھا۔ مظہر امام کو اب میں بڑے اطمینان سے اپنا اڑوسی ماننے لگا ہوں کیونکہ پڑوسی تو وہ ہوتا ہے جس سے آپ یا خود پڑوسی بقدر ظرف اور بوقت ضرورت چائے کی پتی' دودھ اور چینی وغیرہ بلا تکلف مانگ سکیں۔ میرے پڑوسی تو مجھ سے اکثر مانگتے ہیں۔ میں نہیں مانگتا یہ ایک الگ بات ہے۔ یوں بھی میں اپنے اور پڑوسیوں کے درمیان ایک شریفانہ فاصلہ قائم رکھنے کا اس درجہ قائل ہوں کہ پچھلے دنوں میرے ایک دس سالہ پڑوسی کا ایک سفر میں اچانک ساتھ ہو گیا تو مجھے پہچان کر بولے۔ "حضور! میں نے آپ کو اکثر ہاؤسنگ سوسائٹی میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ آپ وہاں کس سے ملنے آتے ہیں؟" اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ میں اصل میں اپنے آپ سے ملنے کے لئے ہی ان کی ہاؤسنگ سوسائٹی میں آتا ہوں۔ ایسی ہی باتوں کی وجہ سے مجھے اڑوسی' پڑوسیوں کے مقابلے میں بہت اچھے لگتے ہیں۔ اب مظہر امام کو ہی لیجئے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے چائے کی پتی مانگی اور نہ ہی میں نے ان سے چینی' یہ ضرور ہے کہ کبھی آزاد غزل سننے کو جی چاہا تو ان کی طرف چلے گئے۔ کبھی کوئی رسالہ یا کتاب مانگ کر لے آئے۔ طبیعت ناساز ہو تو اپنے

ادیب دوستوں کی غیبت کرنے کے لئے ان کے ہاں جا دھمکے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ پڑوسیوں سے آپ کے تعلقات مادی اور افادی ہوتے ہیں۔ جب کہ اڑوسیوں سے آپ کے تعلقات کی نوعیت ثقافتی ہوتی ہے اور جسے مظہر امام جیسا عالم و فاضل اور صاحب علم و دانش اڑوسی مل جائے اس کی خوش بختی کے کیا کہنے۔

مظہر امام ہمارے عہد کے بے حد ممتاز شاعر' ادیب' دانشور اور نقاد وغیرہ ہیں اور ان کا شمار اردو کے مستند اور سینئر ترین شعراء کی صف میں ہوتا ہے لیکن میں جب بھی انہیں بڑے شعراء کی صف میں بیٹھا ہوا دیکھتا ہوں تو کوفت ہوتی ہے کہ یہ غفلت میں کہاں جا کر بیٹھ گئے۔ انہیں تو اصولاً مارکونی' ایڈیسن' رائٹ برادران' نیوٹن وغیرہ کی صف میں ہونا چاہئے کیونکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ آزاد غزل کے موجد ہیں اور ہمارے ہاں موجدوں کا رتبہ شاعروں اور ادیبوں سے ہمیشہ بلند سمجھا جاتا ہے۔ آپ حیرت کریں گے کہ 1945ء میں ہمارا ملک ابھی آزاد بھی نہیں ہوا تھا کہ مظہر امام نے اپنے بل بوتے پر غزل کو آزاد کرالیا تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ عظیم کارنامہ صرف پندرہ برس کی عمر میں انجام دیا تھا۔ اس اعتبار سے بھی یہ دنیا کے سب سے کمسن موجد قرار پاتے ہیں۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔

میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا کہ مظہر امام کی اس ایجاد کے بارے میں کچھ اظہار خیال کروں۔ کیونکہ جب میں پابند غزل کے بارے میں ہی کچھ نہیں جانتا تو آزاد غزل کے بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ تاہم میں نے انہیں ہمیشہ یہ شکایت کرتے ہوئے پایا کہ اہل ادب نے ان کی اس بیش قیمت ایجاد سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا۔ اب میں انہیں کیسے دلاسہ دوں کہ ایٹم بم کے موجد نے بھی بڑی لگن اور جستجو کے ساتھ ایٹم بم بنایا تھا (اگرچہ پندرہ برس کی عمر میں نہیں بنایا تھا کیونکہ بچوں سے ایسی چیزیں بنتی بھی نہیں۔ پھر ہر کوئی مظہر امام کی طرح خداداد صلاحیت لے کر تھوڑی پیدا ہوتا ہے) لیکن ایٹم بم کی ایجاد کا مطلب یہ بھی تو نہیں کہ دنیا میں اسے جگہ جگہ پھینکا جائے اور اسے عوام میں مقبول بنایا جائے۔ موجد کا کام فقط کسی چیز کو ایجاد کرنا ہوتا ہے۔ اسے اپنی ایجاد کے استعمال کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہر چیز کے استعمال کا ایک وقت ہوتا ہے۔ مثال آپ کے سامنے ہے کہ جب وقت آیا تو بتایئے ایٹم بم ہیروشیما اور ناگاساکی میں استعمال ہوا یا نہیں؟ خدا پر بھروسہ رکھیں آزاد غزل کو بھی ایک دن اس کے ہیروشیما اور ناگاساکی ضرور مل جائیں گے۔

ادب مظہر امام کی زندگی کا نہ صرف بنیادی کام ہے بلکہ اسے ان کا جزو ایمان سمجھیے۔ ادب سے ایسا والہانہ سروکار میں نے کسی اور ادیب میں نہیں پایا۔ آپ کسی بھی وقت ان کے گھر چلے جائیں۔ انہیں ادب کی تخلیق کرتے ہوئے یا پہلے سے تخلیق شدہ ادب کو پھر سے سجاتے اور سنوارتے ہوئے پائیے گا۔ سب سے اہم بات یہ کہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے باوجود انہوں نے ادب سے اپنے سروکار میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ میں ایسے کئی عہدیدار ادیبوں کو جانتا ہوں جو جب تک برسرکار رہے، اپنے دفتر کی اسٹیشنری کے بل بوتے پر ادب سے اپنے سروکار کو خوب پھیلائے رکھا۔ لیکن جیسے ہی ریٹائر ہوئے اس سروکار کی لگام کھینچ لی۔ بعض اوقات مجھے بھی مظہر امام کی ڈاک کو دیکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اردو کے بے شمار ناقابل مطالعہ رسائل اور اخبارات کے علاوہ روزانہ ان کے پاس دس پندرہ خط تو ضرور آتے ہیں اور کم وبیش اتنے ہی خط مظہر امام کی طرف سے جواباً جاتے ہیں۔ مظہر امام کے نام آنے والے خطوط کو میں عموماً مشاہیر کے خطوط کہتا ہوں کیونکہ ان کے نام آئے ہوئے بعض مشاہیر کے خطوط کا مجموعہ کچھ عرصہ پہلے نصف ملاقات کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ غالباً اسی خوف کے مارے میں نے مظہر امام کو کبھی کوئی خط نہیں لکھا کہ خدانخواستہ کہیں میرا شمار بھی مشاہیر میں نہ ہونے لگ جائے۔ بہرحال ان کے ہاں ڈاک کی اتنی آمدورفت ہوتی ہے کہ ہمارے بعض سرکاری محکموں میں بھی نہ ہوتی ہوگی اور مزے کی بات یہ ہے کہ ادب سے اس سارے سروکار کا سارا خرچ وہ سراسر اپنی جیب سے برداشت کرتے ہیں۔ ہے کوئی ہمارے درمیان ایسا ادیب جو اپنی پنشن کو یوں ادب کی راہ میں بے دریغ لٹانے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

وہ بے حد منظم اور ڈسپلن کے پابند آدمی ہیں۔ ان کے لکھنے پڑھنے کا ایک الگ کمرہ ہے جہاں وہ رجسٹر بھی رکھا ہوتا ہے جس میں وہ اپنی حاضری لگوانے کے علاوہ روز کے روز آنے والے خطوط مع تاریخ اور لکھنے والے کے نام اور خط کے نفس مضمون کے خلاصہ کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔ اس رجسٹر کے ایک خانہ میں جواب دینے کی تاریخ بھی لکھی جاتی ہے۔ پھر الماریاں ہیں کہ کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ ایسی کتابیں جنہیں آپ ناک پر رومال رکھ کر چمٹے سے پکڑنا بھی گوارا نہ کریں گے۔ انہیں بھی سینت سینت کر ان الماریوں میں نہایت قرینے سے صاف ستھری کتابوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو انہوں نے اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے کو بالکل دفتر کی طرح بنا رکھا ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ کسی کو بلانا بھی ہو تو سیدھے سیدھے آواز نہیں لگاتے بلکہ وہیں میز پر بیٹھے بیٹھے گھنٹی بجا دیتے ہیں۔ شاید اسی گھنٹی کا فیض ہے

کہ بیگم مظہر امام جب بھی مظہر امام سے مخاطب ہوتی ہیں تو انہیں صاحب صاحب کہہ کر ہی بلاتی ہیں۔ گویا ادھر گھنٹی بجی اور وہ ادھر صاحب صاحب کہتی ہوئی پہنچ جاتی ہیں۔ دفتر کی طرح ہی وہ ٹھیک وقت پر اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ چونکہ گھڑی نہیں دیکھتے اسی لئے دیر تک کام کرتے ہیں اور اوپر سے اوور ٹائم کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔ سردی کے موسم میں باضابطہ سوٹ بھی پہنے رہتے ہیں ٹائی کے ساتھ۔ ادب کے کام کو اس اہتمام سے انجام دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

مظہر امام ایک شخصیت نہیں بلکہ انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ جتنی معلومات ان کی الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں میں بند ہیں ان سے کہیں زیادہ معلومات خود مظہر امام کی ذات میں بند ہیں۔ کسی بھی موضوع پر ان سے سوال کیجئے تو وہ اس کی پوری تاریخ اس کے سالم جغرافیہ کے ساتھ بیان کر دیں گے۔ کسی کتاب کے بارے میں پوچھیں تو بتا دیں گے کہ اس کتاب کے کون سے صفحے کی کون سی سطر میں کیا لکھا ہوا ہے۔ ایسا حیرت انگیز حافظہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ میں اکثر ان سے کہتا ہوں کہ جب آپ کی ذات میں خود اتنا علم پوشیدہ ہے تو گھر میں اتنی ساری کتابیں رکھنے کا تکلف کیوں کرتے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ جب سے مظہر امام میرے اڑوسی بنے ہیں تب سے میں نے اپنی بیشتر کتابیں انجمن ترقی اردو کو دے دی ہیں۔ اب اپنی لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ کوئی اور کتاب نہیں رکھتا کیونکہ مظہر امام جیسا اڑوسی کسی کو مل جائے تو اسے اپنے پاس کتاب رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر کسی حوالے کے لئے کتاب کو کھولنا پڑ جائے تو اس کی گرد بھی جھاڑنی پڑتی ہے اور اردو کتابوں پر تو ان دنوں کچھ زیادہ ہی گرد پائی جاتی ہے بلکہ ان کے اوپر اتنی گرد نہیں ہوتی جتنی کہ اندر پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی حوالہ کے لئے کسی کتاب کی ضرورت پیش آتی ہے تو فوراً مظہر امام کو فون کر دیتا ہوں یا ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ مجھے کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ بلکہ کتاب کی گرد بھی وہی جھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ نہ صرف ادب کے بارے میں بلکہ ادیبوں اور فنکاروں کے بارے میں بھی گہری معلومات رکھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ کرشن چندر سے سلمیٰ صدیقی کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ کیفی اعظمی نے شوکت کیفی کو پہلے پہل کب دیکھا تھا۔ حد ہو گئی کہ ایک بار مجھ ناچیز کے بارے میں بھی بعض ایسے حیرت انگیز انکشافات کر چکے ہیں جن کے تعلق سے مجھے یہ گمان تھا کہ انہیں میرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔

ہمارے مظہر امام کے بارے میں ایک بات اور بتا دوں کہ بلا کے حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔

اتفاق سے کہیں سچ مچ حسن دستیاب ہو جائے اور ایسے میں مظہر امام ساتھ میں ہوں تو میں حسن کو نہیں دیکھتا بلکہ مظہر امام کو دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ اگر حسن کا شمار دیکھنے کی بجائے دکھانے کی چیزوں میں ہوتا تو بلاشبہ مظہر امام دائمی بدہضمی کے شکار رہتے۔ مانا کہ ان کا حافظہ بہت غضب کا ہے لیکن اگر کہیں اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہویدا ہو جائے تو انہیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ وہ شادی شدہ ہیں اور یہ کہ بیگم مظہر امام بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ لڑکپن سے ان کا مزاج عاشقانہ رہا ہے لیکن آفرین ہے ان پر کہ آج بھی اپنے لڑکپن سے دستبردار نہیں ہوئے۔ یہ تو خود انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ پندرہ برس کی عمر میں جب انہوں نے نرگس کی پہلی فلم دیکھی تو اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئے اور اس سے شادی کرنے کی ٹھان لی۔ نرگس کے عشق میں اپنا اور اردو شاعری دونوں کا برا حال کر لیا یعنی نرگس کی یاد میں شعر تک کہنے لگے (خیال رہے کہ انہوں نے آزاد غزل کا تجربہ بھی پندرہ برس کی عمر میں ہی کیا تھا) اس والہانہ عشق کی خوبی یہ تھی کہ جس سے عشق فرماتے تھے اسے کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ ہجر اور وصال دونوں ہی کیفیتوں کا بوجھ اکیلے ہی چپ چاپ برداشت کرتے رہے۔ ان کے اس بے لوث اور بے ضرر افلاطونی عشق نے یہ تک گوارا نہ کیا کہ دربھنگہ سے نکل کر بمبئی ہی چلے جاتے اور اپنے محبوب سے اپنے دل کا حال بیان فرماتے۔ اندیشہ تھا کہ کہیں ان کی غیرت عشق کو رسوائی کا منہ نہ دیکھنا پڑ جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر یہ دربھنگو سے ممبئی چلے جاتے تو نرگس سے ان کی شادی ہو جاتی۔ البتہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ ان کا شمار بھی اس وقت کے مقبول فلمی ہیروؤں میں ہونے لگتا۔ جن لوگوں نے مظہر امام کی نوجوانی کی تصویریں دیکھی ہیں وہ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اس زمانہ میں وہ اس وقت کے بعض مروجہ اداکاروں جیسے بھارت بھوشن اور کرن دیوان سے تو بدرجہا خوبرو اور وجیہہ تھے۔ بہرحال نرگس سے عشق کے معاملے میں جب راج کپور نے ان کے دل کو چھلنی چھلنی کرنا شروع کیا تو انہوں نے بادل ناخواستہ اپنے بے لوث عشق کا رخ اوروں کی طرف پھیر دیا مگر یہاں بھی وہی دشواری پیش آئی کہ کہیں کشور کمار نے راستہ کاٹا، کہیں کمال امروہوی خم ٹھونک کر ان کے مدمقابل آ گئے مگر جب کامیڈین محمود تک نے انہیں آنکھیں دکھانی شروع کر دیں تو چار و ناچار مبینہ بھابی سے شادی کر لی۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

فلموں سے مظہر امام کی دلچسپی بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ ایک بار ان کی کتابوں میں سے مجھے ریاضی

کے مضمون کی ایک کاپی مل گئی۔ 1944ء کی۔ جب وہ نویں یا دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ بہت خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں انہوں نے ریاضی کے سوالوں کے غلط جوابات نہایت فصیح و بلیغ اردو میں لکھ رکھے تھے۔ البتہ کاپی کے بائیں جانب والے صفحات پر جا بجا نہایت خوب صورت انگریزی ہینڈ رائٹنگ میں فلموں کے نام' اداکاروں کے نام' فلم دیکھنے کی تاریخ' اس سنیما گھر کا نام جہاں فلم دیکھی گئی تھی اور متعلقہ فلم کی کہانی کی تفصیلات درج تھیں۔ پھر ہر فلم کی تفصیل کے نیچے فلمی ہیروئنوں کی اداکاری سے کہیں زیادہ ان کے حسن جہاں سوز کی تعریف کچھ اس ڈھنگ سے کی گئی تھی کہ 1944ء میں چھوڑے گئے ان کے تیروں سے میرا 1999ء کا کلیجہ تک چھلنی چھلنی ہونے لگا۔ میں نے انہیں کاپی دکھائی تو بولے۔ ''یہ آپ کو کہاں سے مل گئی۔ اصل میں مجھے ان دنوں فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کے کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو آپ کے غلط جوابات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔''

جھینپ کر بولے۔ ''میں جب بھی کوئی فلم دیکھتا تو اس کے بارے میں اپنے تاثرات کاپی پر لکھ لیتا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''مگر یہ تاثرات آپ انگریزی میں کیوں لکھتے تھے؟''

معصومیت سے بولے۔ ''تاکہ گھر والوں کو پتہ نہ چلے کہ کیا لکھا ہے۔''

اللہ اللہ وقت بھی کیا ظالم شے ہے۔ ایک زمانہ میں کسی چیز کو پوشیدہ رکھنا ہوتا تھا تو اسے انگریزی میں لکھا جاتا تھا۔ اب اس مقصد کے لئے بے چاری اردو زبان کو زحمت دی جاتی ہے۔

فلموں کی بات چل نکلی ہے تو ایک واقعہ یاد آ گیا۔ مظہر امام نے پندرہ برس پہلے سری نگر ٹیلی ویژن کے لئے دلیپ کمار سے ایک طویل انٹرویو لیا تھا۔ اتفاق سے ٹیلی ویژن کے لئے دلیپ کمار کا یہ پہلا انٹرویو بھی تھا۔ مظہر امام کے پاس اس انٹرویو کا کوئی کیسٹ نہیں تھا جس پر یہ ہمیشہ دکھ کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن انہیں کہیں سے یہ کیسٹ مل گیا اور اسے دیکھنے کے لئے انہوں نے وی سی آر چلایا ہی تھا کہ میں ان کے ہاں جا دھمکا۔ پندرہ برس پرانے اس انٹرویو کو دیکھنے میں ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ میری آمد پر مجھ سے مصافحہ کرنا تو دور کی بات رہی زبان سے علیک سلیک تک نہ کی۔ میری طرف دیکھے بغیر صرف ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور خود انٹرویو دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر میں خاموش رہا'

پھر خیال آیا کہ ایسا بھی کیا دلیپ کمار کہ ایک دوست کی خاطر کچھ دیر کے لئے ہی سہی' کیسٹ کو روکا نہ جا سکے۔ لہٰذا میں نے انہیں جان بوجھ کر ڈسٹرب کرنے کی غرض سے پوچھا۔ ''جناب یہ کیا دیکھا جا رہا ہے؟''

نظریں ہٹائے بغیر بعجلت ممکنہ بولے۔ ''دلیپ کمار اور میں یعنی میں اور دلیپ کمار۔''

جب انہوں نے پھر چپ سادھ لی تو میں نے اب کی شرارتاً پوچھا۔ ''مگر یہ تو بتائیے کہ ان دونوں میں دلیپ کمار کون ہے؟'' بڑے گہرے انہماک کے ساتھ بولے۔ ''دائیں طرف میں ہوں اور بائیں طرف دلیپ کمار۔''

بخدا ان کے اس صحیح جواب کے بعد میری ہمت نہیں پڑی کہ ان کے انہماک کو بھنگ کروں کیوں کہ مجھے یہ شبہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ خود دلیپ کمار اور دلیپ کمار کو مظہر امام سمجھ کر تو یہ انٹرویو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ مظہر امام کے ایسے ہی معصوم رویے مجھے بہت بھلے لگتے ہیں۔

انہوں نے جب اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا تو وہ اردو زبان و ادب کے عروج کا زمانہ تھا۔ آج اردو کا دائرہ سمٹتا جا رہا ہے تو تب بھی وہ اسی زور و شور' رفتار اور مقدار کے ساتھ اردو ادب تخلیق کئے چلے جا رہے ہیں جب کہ میں کبھی کبھی اردو کے تعلق سے مایوس ہو جاتا ہوں۔ کچھ برس پہلے کی بات ہے کہ مظہر امام ایک لڑکے کو گھر کے کام کاج کے لئے باہر سے لے آئے تھے۔ نو دس برس کا ہوگا۔ مظہر امام اور بیگم مظہر امام اسے اپنے بچے کی طرح چاہتے تھے۔ جب بھی وقت ملتا دونوں اسے اردو پڑھایا کرتے تھے۔ چونکہ گھر میں کام کاج زیادہ نہیں تھا لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے وہ اردو پر حاوی ہو گیا۔ بڑی روانی کے ساتھ اردو پڑھنے اور لکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے مظہر امام نے اسے اردو لکھنے پڑھنے کے کام پر ہی اپنے ہاں نوکر رکھ چھوڑا ہے۔ اس نے آداب بھی مظہر امام کے سے اپنا لئے تھے۔ سلام بھی اس طرح کرتا تھا جیسے کسی نے اس کے شعر پر داد دی ہے۔ اردو کے لئے مظہر امام کے اس بے لوث جذبہ کی میں دل سے قدر کرنے لگا تھا۔ میں جب بھی اس لڑکے کو دیکھتا اپنے آپ پر لعنت بھیجتا کہ مجھے تو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے نواسوں اور پوتوں کو ہی اردو پڑھا دوں۔ مظہر امام کو دیکھو غیروں تک کو اردو پڑھا رہے ہیں۔ بے شک اردو کو ایسے ہی بے لوث قدر دانوں کی ضرورت ہے۔ مگر ایک دن یوں ہوا کہ میں مظہر امام کے ہاں گیا تو یہ لڑکا گھر پر اکیلا موجود تھا۔ پتہ چلا کہ مظہر امام اور بیگم مظہر امام مارکیٹ تک گئے ہیں اور ابھی آنے والے ہیں۔ میں ان کی واپسی کے انتظار میں رک گیا تو سوچا کہ کیوں نہ اس لڑکے کی اردو دانی کا امتحان لیا جائے۔ میں نے کہا۔

''اردو کے کچھ اچھے شعر یاد ہوں تو سناؤ۔'' جواب میں اس نے چار شعر سنائے جو سب کے سب مظہر امام کے تھے۔ میں نے کہا۔ ''اردو کی ان کتابوں کے نام بتاؤ جنہیں تم پڑھ چکے ہو۔'' رٹا لگانے والے طالب علم کی طرح جھٹ سے بولا۔ ''زخمِ تمنا''، رشتہ گونگے سفر کا''، ''بند ہوتا ہوا بازار''، ''آتی جاتی لہریں''، ''اکثر یاد آتے ہیں''، ''ایک لہر آتی ہوئی''۔

مجھے اچانک احساس ہوا کہ جسے میں اردو کے لئے مظہر امام کا بے لوث جذبہ سمجھ رہا تھا۔ وہ اتنا بے لوث بھی نہیں ہے۔ بلکہ بالوث زیادہ ہے کیونکہ وہ تو اردو کا نہیں بلکہ اپنا ذاتی قاری پیدا کرنے مین مصروف ہیں لیکن اب میں اس بات کو بھی برا نہیں سمجھتا کیونکہ یہ لڑکا اب اردو لکھنا پڑھنا سیکھ کر اپنے وطن واپس چلا گیا ہے۔ وہاں اس پر یہ پابندی تھوڑا ہی ہے کہ وہ ہر دم اپنے مالک کی کتابیں ہی پڑھتا رہے۔ پھر ایک نہ ایک دن اسے اچھے برے کی تمیز بھی تو ہو جائے گی اور کیا عجب کہ وہ ہم جیسوں کی کتابیں بھی پڑھنا شروع کر دے۔

مظہر امام کی کتابوں کا ذکر آ ہی گیا ہے تو مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے۔ مظہر امام اور جوگندر پال دونوں مل کر کسی ادبی تقریب میں شرکت کے لئے پٹنہ گئے تھے۔ وہاں سے ان دونوں کا ارادہ مظہر امام کے آبائی شہر دربھنگہ بھی جانے کا تھا لیکن عین وقت پر پورا دربھنگہ سیلاب کی زد میں آ گیا اور یہ وہاں نہ جا سکے۔ واپس آ کر اپنی مجبوری بتائی تو میں نے کہا۔ ''حضور! یہ سب آپ کی کتابوں کی دین ہے۔''

پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھ لیجئے آپ نے اپنی کتابوں کے نام کیسے رکھ چھوڑے ہیں۔ آتی جاتی لہریں ایک لہر آتی ہوئی اگر آپ اپنی کسی کتاب کا نام ایک لہر جاتی ہوئی ہی رکھ دیتے تو شاید دربھنگہ سیلاب کے عذاب سے بچ جاتا۔''

مظہر امام کی حس مزاح بہت تیز ہے اور وہ ایسی باتوں پر جی کھول کر قہقہہ لگانا جانتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک نہایت معصوم اور سادہ لوح انسان ہیں اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ستر برس کے ہو جانے کے باوجود آج بھی ان کے اندر ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے جسے وہ پال پوس کر دن بہ دن چھوٹا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے اندر بیٹھے ہوئے لڑکے کے تیور اختر الایمان کے لڑکے کی طرح نہیں ہیں جو بات

بات پر اختر الایمان سے پوچھ بیٹھتا ہے۔ ''اختر الایمان تم ہی ہو؟'' مظہر امام کا لڑکا تو اتنا خوش مزاج ہے اور ان سے اتنا بے تکلف ہے کہ آنکھ مار کر مظہر امام سے پوچھتا ہے۔ ''پیارے مظہر امام! کیسے ہو؟ کس حال میں ہو؟ خوش تو ہو نا؟'' اور اس کے جواب میں مظہر امام تحیر اور تجسس کی رنگ برنگی تتلیوں کو پکڑنے کے لئے ان مانوس راستوں پر نکل پڑتے ہیں جو انہیں ان کے بچپن کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے اندر زندگی جینے کے لئے ایک بچہ کی طرح ہمک ُللک اور چمک موجود ہے۔ وہ نہایت نفیس، مہذب، شائستہ اور سلیقہ مند انسان ہیں۔ بھلے ہی کوئی انہیں اپنی خوشیوں میں شامل نہ کرے لیکن یہ گھس گھس کر ہر ایک کے دکھ درد میں ضرور شریک ہو جاتے ہیں اور یہی رویہ ایک سچے فنکار کا طرہ امتیاز ہے۔ جوں جوں میں اپنی تاریخ پیدائش سے دور اور اپنی تاریخ وفات سے قریب ہوتا جا رہا ہوں اور اب جب کہ میں نے اپنا آخری پڑاؤ ڈال دیا ہے تو اپنے آپ کو اس لحاظ سے خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ اس آخری پڑاؤ میں مجھے مظہر امام کی رفاقت میسر آ گئی ہے۔ یہ ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جو مجھے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاسلہ پر ہی مل جاتی ہے۔ جہاں علم و فضل اور شعر و ادب تو ہے ہی، پیار اور خلوص کے علاوہ محبت اور یگانگت بھی ہے۔ ذرا سوچئے کہ یہ چیزیں مجھے زندگی میں کتنی دیر سے میسر آئی ہیں۔ اسی لئے ان چیزوں سے بھرپور استفادہ کرنے کا جب بھی خیال آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ میری عمر اور بھی دراز ہو بشرطیکہ ساتھ میں مظہر امام کی عمر بھی دراز ہو ورنہ میں اس عمر طویل کو لے کر کیا کروں گا۔ مانا کہ غالب کی ریاضی کمزور تھی اور وہ ضرورت شعری کے تحت ایک سال میں سے پچاس ہزار دن تک برآمد کر لیا کرتے تھے۔ میری دعا ہے کہ مظہر امام برسہا برس ہمارے درمیان رہیں۔ چاہے ہر برس کے 365 دن ہی کیوں نہ ہوں۔

(سہ ماہی خیال۔ مظہر امام نمبر)

پروفیسر مجتبیٰ حسین

آزر زوبی

چوبیس پچیس برس ادھر کی بات ہے سن یاد نہیں۔ مدنی، صادقین یہ خاکسار اور کچھ دیگر حضرات کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ آزر زوبی کافی ہاؤس میں نظر آئے۔ ان کے ساتھ غالباً سجاد اختر تھے۔ زوبی سیدھے اس میز کی طرف آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ کرسی پر پہنچتے ہی بغیر کسی تمہید کے انہوں نے مجھ سے کہا کہ رسالہ "شعور" کی ادارت سنبھال لوں۔ لہجے میں پیشکش کا انداز نہیں تھا بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ طے شدہ ہے اور میرے واسطے کسی عذر کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے انہیں دیکھا۔ وہ مسکرائے۔ "تو کل سے آپ شعور کے دفتر آ جائیے۔ دیکھا تو ہو گا آپ نے۔ وہی جہاں میں رہتا ہوں۔"

زوبی اس وقت صدر میں ایمپریس مارکیٹ کے پاس ایک بڑے سے مکان میں رہتے تھے جو کراچی کے پرانے مکانوں کی طرح کچھ لکڑی، کچھ سیمنٹ کا بنا ہوا تھا۔ اسی مکان میں ان کا نگار خانہ اور چھاپے خانہ تھا۔

میں نے ذرا توقف کیا۔ زوبی بولے۔ "تو پھر طے ہے۔" بڑی خود اعتمادی کا لہجہ تھا۔

"میں کل آپ کے دفتر آ جاؤں گا۔ پھر بات ہو گی۔" کافی پی گئی پھر وہ اٹھے۔ ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔ یہ بہت عجیب سا انداز تھا۔ تاجرانہ تھا۔ نہ دوستانہ۔ تحکمانہ بھی نہ تھا۔ بس عجیب تھا۔

زوبی کو اس سے پہلے میں نے دیکھا تھا مگر ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ جس میں زوبی ذرا دیر کے لئے آئے۔ شعور کی ادارت کی بات کی اور پھر چلے گئے۔ گویا سب بات طے ہو چکی ہے اور میں شعور کا مدیر بن چکا ہوں۔

دوسرے دن میں ماہنامہ شعور کے دفتر گیا۔ زوبی آئے۔ ہاتھ ملایا۔ مسکرائے اور بولے ادارت کا معاوضہ کیا ہو گا؟

میں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ میرے کام میں دخیل نہ ہوں۔ شعور کی تزئین آپ کے ذمے اور مضامین کی فراہمی میرے ذمے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ میں نے کہا کہ پالیسی میری ہو گی اور ہفتے میں صرف ایک بار آؤں گا۔ بولے آپ جائیں۔ شعور کو چلانا آپ کا کام ہے۔"

میں اٹھا۔ انہوں نے پھر ہاتھ ملایا۔ زوبی کم سخن ہیں۔ کام کی باتیں کرتے ہیں۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے برملا کہہ دیتے ہیں جو انہیں نہیں یا کم جانتا ہے۔ وہ انہیں کاروباری آدمی سمجھتا ہے مگر جس نے ان کے ہاتھ ملانے کے انداز کو

محسوس کیا ہے اس نے زوبی کو پالیا ہے۔ زوبی کی انگلیوں میں گرمجوشی ہے' قربت ہے اور شاعری ہے۔ یہ توانا شخصیت کی توانا انگلیاں ہیں جنہوں نے نقاشی بھی کی ہے اور مجسمہ سازی بھی۔

زوبی کے نگار خانے میں چلے جایئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ اس جگہ آ گئے ہیں جہاں محنت حسن ہے اور حسن محنت ہے۔ ہر نقش ملکی ثقافت کا امین ہے۔ سیاہ رنگ وصال کی اندھیری راتوں کی داستان سناتا ہے۔ صباحت کھیتوں کی صبح بن کر نمودار ہوتی ہے۔ زوبی کی انگلیاں تخلیقی تسلسل کا نغمہ ہیں۔ ماں اور بچہ۔ کینوس کے نقوش' کہیں رباعی میں' کہیں غزل میں اور کسی فیورال کی صورت میں طویل نظم!

یہ انگلیاں مجسمہ ساز بھی ہیں۔ آپ کو زوبی کے نگار خانے میں کچھ شاعر اور ادیب کے بسٹ ملیں گے۔ ان کے خدوخال کو اتنے فن کارانہ طور پر ابھارا گیا ہے کہ باطن ظاہر بن گیا ہے اور ظاہر باطن۔

زوبی کے ہر کام میں سلیقہ' نفاست اور رنگینی ہے۔

شعور اپنی وضع کا ایک ہی ماہنامہ تھا۔ ٹائپ میں چھپتا رہا۔ مگر ہر ورق کف گل فروش تھا۔ مضامین شعور کے صفحات پر کچھ اور نکھر آتے تھے۔ غزلیں اور نظمیں مہک اٹھتی تھیں۔ لکھنے والوں کے اسکیچ' صغرار بھابی کے نقوش' زوبی کے موقلم کی گل فشانی نے شعور کو ایک نادر تحفہ بنا دیا تھا۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے میں بغیر کسی پس و پیش کے عرض کر سکتا ہوں کہ شعور میں عصر حاضر کے ممتاز لکھنے والوں کے علاوہ بعض ایسے مضمون نگار اور شعراء کی تخلیقات بھی شائع ہوئیں جو اس دور کے کسی رسالے میں شاید ہی چھپتی ہوں۔ مثلاً یگانہ پر ممتاز حسین جونپوری مرحوم کا مضمون یا اجتبیٰ رضوی کا کلام یا یگانہ کی ایسی غیر مطبوعہ غزلیں جو اس سے پہلے کہیں اور شائع نہیں ہوئی تھیں۔

افسوس کہ یہ رسالہ چند در چند وجوہ کی بناء پر زیادہ چل نہیں سکا اور اسے بند کرنا پڑا۔ ایسے خوب صورت رسالے کو بند ہونا ہی تھا۔ بند ہوا۔

لیکن زوبی سے تعلقات کی جو نوعیت تھی وہ آج بھی ہے۔ وہ پہلے ہی دن سے دوست تھے اور آج بھی ہیں۔ جب بھی ملتا ہوں دوست اور دوستی پر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ وہ کس پائے کے مصور اور مجسمہ ساز ہیں۔ میں اس بارے میں کچھ کہنے کا اہل نہیں ہوں۔ البتہ ایک بات ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں۔

زوبی نے اپنے کو مصور ثابت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے بال ضرورت سے زیادہ بڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی گردن میں فن کارانہ بے دماغی کا خم نہیں ہے۔ آنکھوں میں خواب بسانے کی کوئی کوشش نہیں پائی جاتی۔ گفتگو اخفائے راز قسم کی نہیں کرتے۔ شخصیت کو ایب نارمل بنانے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ عام آدمیوں کی طرح ملتے ہیں۔ بات کرتے ہیں باعمل آدمی ہیں مگر جب آپ ان کے نگار خانے میں داخل ہوں تو یہ عام آدمی یہ آزر زوبی سرزمین پاکستان کی روح کا مظہر بن جاتا ہے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین کے نام خطوط

حبیبی وعزیزی مجتبیٰ سلمہ اللہ تعالےٰ۔ دعائیں

میں نے ڈاکٹر محمود احمد مرحوم کے خصوصی نمبر کے لیے کئی ورق لکھے لیکن آخر سب کو چاک کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ مبادا شاہ صاحب مدظلہ' کو جس قسم کے مضمون کی توقع ہو اس سے میرا مضمون کم ہو اور نتیجہ میں کالج کا نقصان ہو۔ مجھے اس قسم کی عبارتوں کا تجربہ نہیں اس لئے آپ سے التجا ہے کہ تمام نزاکتوں کو مدنظر رکھ کے چند سطریں ''گھسیٹ'' دیجے اور مجھے فوراً ہوائی ڈاک سے روانہ کر دیں تاکہ میں انہیں اپنی جانب سے شاہ صاحب کو روانہ کر دوں۔ ڈاکٹر محمود احمد صاحب سے میری تیس برس کی دوستی تھی۔ ہم لوگ مسلم لیگ میں ہمہ کار تھے اور اس تیس برس میں ایک بار بھی مجھے ان کے خلوص پر شبہ نہیں ہوا۔ آخری ملاقات لندن میں ۶۸ء میں ہوئی اور یہاں کی مسلم آبادی کی تعلیم وغیرہ کے بارے میں بڑی تفصیلی گفتگو رہی۔ طے یہ ہوا تھا کہ ۶۹ء کی گرمیوں میں جب یہاں واپس آئیں گے تو دو ایک مہینے رہ کر کوئی تحریک شروع کی جائے گی لیکن مشیت کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ مرحوم کے واپس ہونے کے ایک یا دو مہینے کے بعد ایک دوست نے بتایا کہ وہ مکہ' معظمہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے' جہاں کی خاک تھی وہیں پہنچی۔ محمد و آلِ محمد علیہ التحیۃ والسلام سے انہیں جس قدر محبت ومودت تھی وہ شاہ صاحب کی تربیت سے بڑھتی جارہی تھی مذہب کی خشکی کے بجائے ان میں تصوّف کی شادابی آ گئی تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ اختلافات رنگ نسل دور ہوتے جارہے تھے۔ ان کی نظر ''ترک رسوم'' اپنی جگہ ایک مستقل مذہب تھا۔ توحید کو وہ عام لوگوں کی طرح نہیں مانتے تھے چونکہ خدائے واحد کی پرستش میں بھی اندازِ صنم پرستی آسکتا ہے۔ وہ خدا کو اپناتے نہ تھے بلکہ اپنے کو خدا کا بندہ سمجھتے تھے اور اسی لیے وہ خدائے واحد کو رب العالمین بلاتخصیص مذہب وملت ونسل سمجھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ برصغیر کی مسموم فضائے دینی سے ان کی طبیعت متاثر نہ ہو سکی۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں آپ جو کچھ لکھئے گا وہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے کالج کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

جواب کا منتظر ہوں۔ گھر میں سب کو دعائیں۔

آپ کا دعاگو روسیاہ

ایس احمد

پروفیسر مجتبیٰ حسین کے نام

عقب دیال سنگھ لائبریری۔ نسبت روڈ لاہور نمبر ۷

۶ ستمبر ۱۹۵۹ء

مُحبّی مجتبیٰ صاحب۔ سلام مسنون!

یقین فرمائیے آپ کا خط پا کر بے حد مسرت ہوئی۔

گزشتہ چند برس میں کراچی سے آنے والے متعدد احباب کچھ اس قسم کی خبریں لاتے رہے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ آپ مجھ سے خفا ہیں اور ادھر آپ کے مضامین میں اپنی ذات اور اپنے فن کو قطعی طور پر سے غائب پا کر کچھ یقین سا ہو چلا تھا کہ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ اب آپ کا خط ملا تو یقین کیجیے' سب کدورت دور ہو گئی۔ میں اپنے نظریے اور اپنے فن پر تنقید کا حق آپ کو نہیں دوں گا تو کیا ایم اسلم کو دوں گا؟ آپ متوازن اور معتدل نقاد ہیں۔ آپ کے پاس خود اعتمادی کا جوہر بھی ہے۔ اس صورت میں مجھے تو آپ کی تنقید سے خوش ہونا چاہئے۔ میں تو ایک بالکل نو آموز ادیب کو بھی تنقید کا حق دیتا ہوں آپ تو ماشاء اللہ مسلمہ نقاد ہیں۔ اگر آپ میرے فن کو اپنی تنقیدوں میں تذکرے کے لائق نہیں پاتے تو مجھے قطعی شکایت نہیں ہے۔ میں اپنی دھن میں لگا رہوں گا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ میں سامنے کی بات کہنے کی بجائے فکر کی چمک پیدا کرنے میں کوشاں ہوں۔ اور میں فن میں ڈھول پیٹنے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے تو فکر و فن کا ایک جمالیاتی امتزاج درکار ہے اور اگر آپ ایسے سلجھے ہوئے نقاد بھی کبھی میری اس سعی کی طرف خود بخود متوجہ ہو سکیں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی' مگر میں نقادوں سے داد نچوڑنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لیے باور فرمائیے کہ مجھے آپ کے کسی تنقیدی جملے سے شکایت نہیں ہے۔ مجھے بعض احباب نے چند باتیں آ کر بتائیں۔ اس دوران میں آپ سے ملاقات نہ ہو سکی' ورنہ سب باتیں صاف ہو جاتیں۔ اب آپ کا گرامی نامہ ملا ہے تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے سلسلے میں غلط قسم کے شبہات اتنے عرصے تک ذہن میں بسے رہے۔ آیندہ کوئی بات ہوئی تو فوراً آپ سے رجوع کروں گا۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ ان دنوں آپ کیا کر رہے ہیں۔

آپ کی کتاب کے بارے میں اسی مہینے کے آخر تک برادرم صہبا کو تفصیل سے لکھوں گا۔

آپ کا مخلص: ندیم

غزلیں

پوچھ نہ دل کے ولولے، ولولے بے حساب تھے
دیکھ یہ دشتِ بے گیاہ، جس پہ کبھی سحاب تھے

ساحرِ وقت کا یہ کھیل کتنا عجیب ہے کہ ہم
آنکھ لگی تو بحر تھے، آنکھ کھلی سراب تھے

ذہن کی ہر روش ہے آج خاکِ رُخِ گلِ بہار
بادِ بہار سے یہیں کھلتے ہوئے گلاب تھے

صبح تھی التجائے عشق، شام وفائے حُسن تھی
عمرِ رواں تھی اک سوال جس کے کئی جواب تھے

ماہ وشوں کی بستیاں، سایۂ ابرِ برشگال
پھول ہی پھول شاخ شاخ، پھول بھی انتخاب تھے

زُلف کے تار تار میں نیند گندھی تھی رات کی
جسم کے پور پور میں ذوقِ گنہ کے خواب تھے

چشمِ سیاہ تری غزال وحشتِ تازہ دم بدم
دامنِ چاک چاک سے ہم بھی ترا جواب تھے

ابرِ طرب اُمنڈ کر برسا کچھ اس طرح کے بس
سب در و بام آرزو صبح کو زیرِ آب تھے

رات بسر تو ہوگئی، میرے رفیقِ شر کی خیر
ورنہ یہ دن کے مرحلے، جاں کے لیے عذاب تھے

یُوں جو ملے تو کیا ملے، چہرے نظر نہ آسکے
کوچۂ درد میں سبھی ڈالے ہوئے نقاب تھے

چشم ہو اشکبار کیوں، سینہ ہو داغدار کیوں؟
کچھ نہیں زندگی اگر ان کا بھی انتظار کیوں؟

کچھ نہ سمجھ سکے گا تو، کس کی ہے تجھ کو آرزو
تشنگیٔ دوام میں، شوقِ جمال یار کیوں؟

وسعتِ کائنات میں، سیر گہہ حیات میں
دل نہ اگر ترا لگا، شکوۂ روزگار کیوں؟

کیسا سکوت چھا گیا، روزِ فراق آ گیا
اتنے دنوں تو ساتھ تھے، روح ہے بیقرار کیوں؟

دُنیا ہے کیا؟ حیات کیا؟ عقبیٰ ہے کیا؟ ممات کیا؟
یاس ہے کیوں؟ امید کیوں؟ جہد ہے کیوں، فرار کیوں؟

کچھ بھی نہیں ثبات میں، لطف تغیرات میں
عشق ہو کس لیے اداس؟ حسن ہے شرمسار کیوں؟

صابر الم روا نہیں، عشق ہے یہ جفا نہیں
غم ہی نہیں ہے جب تجھے، کوئی ہو غمگسار کیوں؟

☆

ڈس لے کہیں نہ شاخِ گل، گُل کے قریں نہ جایئے
رہیے یہیں قفس میں آپ، اور کہیں نہ جایئے

شوق سے جایئے تمام، قیدِ نظر نہ بندشیں
جذبۂ دل کہے جہاں صرف وہیں نہ جایئے

سچ ہے حسینؑ کربلا، سچ ہے غریبِ نینوا
چین سے اپنے گھر رہیں، سچ کے قریں نہ جایئے

اب وہ خدا شناس ہے، اب ہے اُسے زباں کا پاس
دشمنِ دیں کی بات پر اہلِ یقیں نہ جایئے

عرش سے آپ ہیں خفا، فرش پہ آپ ہیں ملول
جی چکے بس، بہت ہوا، زیرِ زمیں نہ جایئے

مدعیانِ عشق بھی اہلِ ہوس سے جا ملے
خود کو ہی دیکھ لیجیے، دُور کہیں نہ جایئے

اب بھی کسی غریب سے کہتی ہے اک صدائے درد
"آپ کو ہے مری قسم، رہیے یہیں نہ جایئے"

منتخب اشعار

ہر ایک ہو نہیں سکتا شریکِ ناکامی
ہر ایک کھو نہیں سکتا سکونِ ملیامی
کوئی نہیں مرے درد نہاں ترا حامی
تری شریک اگر ہے تو تیری خود کامی

☆

مری نگاہ سے ہر نقش اترتا جاتا ہے
تمام ذوقِ لطافت بکھرتا جاتا ہے
زمانہ رنج کا جتنا گزرتا جاتا ہے
خوشا! وفا کا ہر اک زخم بھرتا جاتا ہے

☆

مجھے ہر ایک سے نفرت ہے اب زمانے میں
فسردگی ہے محبت کے بھی فسانے میں
ہے عار اب مجھے آنسو یونہی بہانے میں
جو لطف کچھ ہے تو اپنے کو اب مٹانے میں
نہ کوئی ہمدم و مونس نہ چارہ ساز مرا
نگاہِ یاس چھپالے خدارا راز مرا

☆

اے دوست تیری پرسش الفت کا شکریہ
کس درجہ ہے خلوص پہ مبنی ترا کرم
اس وقت ڈبڈبائی ہوئی آنکھ پر نہ جا
ہنس ہنس کے میں نے کاٹ دیئے ہیں ہزاروں غم

☆

آہ وہ دن جبکہ تم بے اختیار آتے ہو یاد
اُف وہ ساعت بھول جانے کی تمہیں خواہش ہو جب

خیال آرائیاں

افتخار عارف (اسلام آباد)

جنابِ والا کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ''جمال وکمال'' کے عنوان سے شائع ہونے والی کتاب کا ایک نسخہ موصول ہوا۔ کرم گستری اور یاد فرمائی کے لئے شکر گزار ہوں۔ انشاء اللہ استفادے کی صورتیں نکلیں گی۔ اللہ کریم کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ ہمارے درمیان قائم رکھے۔ امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

طاہر نقوی

'خیال' کا جمال نقوی نمبر موصول ہوا۔ ہر لحاظ سے معیاری اور خوبصورت ہے۔ اس طرح آپ نے ادب کے ایک اہم شخص کی خدمات کو سراہا ہے۔ جمال نقوی کا حق ہے کہ ان کی ادبی صلاحتیوں کو مانا جائے۔ وہ طویل مدت سے اس میدان میں موجود ہیں۔ انہیں تسلیم نہ کرنا جانبداری ہوگی۔ میں ذاتی طور پر ان کی ادبی خوبیوں کا معترف ہوں۔ اس سے قبل بھی آپ نے ان کے فن کا اعتراف کرتے ہوئے ان پر ایک اہم کتاب ''جمال وکمال'' شائع کی ہے۔ جو ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔

قیصر سلیم

خیال کا جمال نقوی نمبر نظر نواز ہوا۔ نمبر گی اشاعت کے لئے جمال نقوی صاحب کا انتخاب بروقت ہے۔ گرچہ ابھی انہیں اور بہت کچھ لکھنا ہے تاہم اب تک جو کام انہوں نے کیا ہے اس کا ذکر ضروری تھا اور حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک نمبر میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خوشی تو اس بات کی اور زیادہ ہے کہ وہ انجینئرنگ کے پیشے سے منسلک ہوتے ہوئے ادب کی اتنی خدمت کر رہے ہیں کہ حیرت تو کم 'ادب کی اہمیت ضرور بڑھ جاتی ہے۔ انشاء اللہ وقت ملا تو مزید ان پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

عشرت رومانی

جمال نقوی ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے رواں صدی کے تقاضوں کے

مطابق زندگی کے اہم شعبوں سے تعلق برقرار رکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندگی ایک ایسی توانائی کا نام ہے جو جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل پیرا ہو کر یہ کہہ رہی ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ جمال نقوی نے اس فلسفۂ حیات کے تحت ادب اور سائنس کی ہم آہنگی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ فقط صاحب جمال ہی نہیں بلکہ صاحبِ کمال بھی ہیں۔ بنیادی طور پر تو انجینئر ہیں مگر ان کی دوسری اہم شناخت ادب ہے جو شاعری اور نثر نگاری پر مشتمل ہے۔

حال ہی میں ادارہ خیال نے ان کی اہم تصنیف "جمال وکمال" شائع کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے فن اور ان کی شخصیت کے حوالوں سے ایک وقیع اور معلوماتی نمبر شائع کیا ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ جلد ہی مفصل طور پر اظہار خیال کروں گا۔ اس اہم پیشکش کے لئے جناب حبیب احسن مدیر "خیال" اور جناب جمال نقوی کو میری جانب سے مبارکباد۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔

فریدہ لاکھانی فرح (سڈنی۔ آسٹریلیا)

جناب حامد علی سید صاحب آپ سے تین سال قبل کراچی میں ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تھی جب میری کتاب "پیمانۂ ہستی" کی رونمائی ہوئی تھی۔ آپ نے اپنا رسالہ سہ ماہی "خیال" پیش کیا تھا۔ ساتھ آپ کی کاوشوں کی حدیث کا پرچہ بھی ملا تھا۔ واقعی ان دنوں خالص ادبی رسالہ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ خدا آپ کے دست ہنر کو سلامت رکھے۔ پرچہ بے حد پسند آیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ تین سال بعد جواب دے رہی ہوں تو عرض ہے کہ یہاں کام کی نوعیت سانس لینے کی بھی فرصت نہیں دیتی' وقت ہمارے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ کی جوابدہی سر پر تلوار بنی لٹکی رہتی ہے لیکن کوشش رہتی ہے کہ علم وادب کے لئے کچھ وقت نکال لیں پہلے آٹھ سال تک اپنے رسالے کے لئے بھی مصروف رہی ہوں۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی لکھتی ہوں قدیم وجدید شعرا پر ریڈیو پروگرام بھی میرے روٹین کا حصہ ہے۔ خاصی مصروفیات رہتی ہے۔ عید کا موقع ہے اور سالِ نو کی آمد بھی۔ خدا کرے یہ نشاط آمیز لمحے آپ کو مبارک ہوں اور نئے سال کی خوشیاں بھی۔ آپ کو اپنی تخلیقات میں سے ایک بھیج رہی ہوں' امید ہے اشاعت کے قابل سمجھیں گے اور رسالہ ارسال کریں گے۔

انور احسن صدیقی

جمال نقوی حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہیں آپ نے ان سے منسوب "خیال" کا خصوصی نمبر

نکال کران کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ اردو ادب کے میدان میں انہوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ قارئین کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ جمال نقوی نہایت متنوع جہتوں کے تخلیق کار ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں، نثر نگار بھی، مترجم بھی اور سائنسدان بھی۔ تعلیم اور پیشے کے لحاظ سے وہ انجینئر ہیں لیکن ادب کے ساتھ ان کی گہری دلچسپی اور وابستگی انہیں ایک معقول اضافی شناخت بھی ادا کرتی ہے۔ اردو میں اب تک ان کی پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں چھ شعری مجموعے ہیں اور تنقیدی مضامین پر مشتمل دو مجموعے بھی شامل ہیں۔ انہوں نے غیر ملکی نثری و شعری تخلیقات کے اردو میں تراجم بھی کیے ہیں۔ سائنسی موضوعات پر مشتمل مضامین کے ان کے دو مجموعے انگریزی میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کا قلم آج بھی برق رفتاری کے ساتھ لکھ رہا ہے اور امید ہے کہ ان کی اور بھی تخلیقات ابھی منصۂ شہود پر آئیں گی۔

نکہت بریلوی

حبیب احسن صاحب خود بھی ایک صاحب شعور تخلیق کار ہیں۔ وہ سخنور تو ہیں ہی، سخن فہمی کی بھی بہتر صلاحیت کے ساتھ ساتھ قدر شناسی کا بھی ملکہ خوب رکھتے ہیں۔ ”خیال“ کے نام سے ایک کتابی سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس کا عام شمارہ بھی خاصا علمی و ادبی مواد مطالعہ کے لیے پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ خاص نمبر بھی خیال کے ایسے شائع ہوئے ہیں جو نہایت قابل تحسین ہیں۔ بعض اہل قلم کے گوشے بھی خیال میں بہت اچھے انداز میں چھپے ہیں۔ زیر نظر نمبر معروف ترقی پسند شاعر ایک عمدہ نثر نگار اور سب سے بڑھ کر ادب کے بہت فعال اور مستعد خدمت گزار کی حیثیت سے ہر حلقہ میں انہیں عزت حاصل ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ انجینئر ہیں، تدبّر و تعمق کے لحاظ سے وہ ایک سچے علیگ کی خصوصیت کے حامل ہیں، شعری تخلیق، تنقید، ترجمہ اور تحقیق میں ان کی تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو کر اہل علم و صاحبان ذوق سے داد وصول کر چکی ہیں۔

حبیب احسن صاحب کا یہ اقدام قدر شناسی اور ادب نوازی کے ضمن میں اعلیٰ درجہ کا حکم رکھتا ہے۔ اس میں جمال نقوی کی شخصیت، ان کی ادبی و سماجی خدمات، فن، مختلف اصناف کے تحت تازہ افکار کے شعری نمونے اور نثری اداریے وغیرہم میں بہت کچھ جمال نقوی کے بارے میں جمع کر دیا گیا ہے۔ مجھے دلی مسرت ہو رہی ہے۔ جمال صاحب کو اس نمبر کی مبارکباد اور حبیب احسن صاحب کو اس کارنمایاں پر سلام پیش کرتا ہوں۔

Quarterly Khayal Karachi Issue No. 22

Royal Process (Nazim)0300-9293862